مبارک تذکرے

تالیف: قمر عثمانی

بشارت منزل دیوبند، یوپی

هٰذا ذکرٌ مبارک

مبارک تذکرے

تالیف

قمر عثمانی

نوٹ: کتاب کو امانت سمجھ کر استعمال کریے تاکہ دوسرے لوگ بھی پڑھ سکیں

ملنے کا پتہ

بشارت منزل دیوبند ضلع سہارنپور

یہ کتاب

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی

حکومت اترپردیش لکھنؤ

کے مالی تعاون سے

شائع ہوئی

فہرستِ مضامین

نام کتاب

مُبارک تذکرے

ناشر: ــــــــــ قمر عثمانی

مؤلف: ــــــــــ قمر عثمانی

تعدادِ اشاعت: ــــــــــ ۶۰۰

قیمت ــــــــــ ۸/-

مطبوعہ: ــــــــــ محبوب پریس دیوبند

کاتب: ــــــــــ سُفیان اعظمی

حرفِ اوّل

اپنے بزرگوں کے حالات و واقعات پر مشتمل میرے یہ چند مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ منتشر اور بکھرے ہوئے مضامین یکجا ہو جائیں تو اور لوگ بھی مستفید ہو سکیں گے اور میرے لئے بھی یہ بات اطمینان اور مسرت کی ہو گی کہ یہ ضائع ہونے سے بچ جائیں گے۔ یہی بات ان مضامین کو یکجا کتابی صورت میں شائع کرنے کا محرک بنی ہے۔

ان مضامین میں بعض وہ ہیں جو بعض بزرگوں کی وفات کے موقعہ پر لکھے گئے ہیں اس وجہ سے ان مضامین میں تعزیتی تاثرات کا رنگ نمایاں ہے۔

ان مضامین میں، میں نے اپنی عقیدت و محبت کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ صحیح حقائق نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائیں۔ اور پڑھنے والا ان بزرگوں کی واقعی عظمت اور حقیقی مرتبہ سے کماحقہ، با خبر ہو جائے اور اپنے اسلاف کی ایسی ایمان افروز اور دل آویز تصور سامنے آئے کہ دل انکی محبت سے لبریز ہو اور طبیعت میں ان کے اتباع کا جذبہ بیدار ہو۔

ہمارے اسلاف کا ایک بہت طویل سلسلہ ہے۔ سب بزرگوں پر بہت سا لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھنے کی گنجائش باقی ہے۔ میں نے موقعہ بموقعہ بغیر کسی خاص ذہنی ترتیب کے جو کچھ لکھا وہی اس مجموعہ میں شامل ہے۔

اب یہ مجموعہ فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی تعاون سے اشاعت پذیر ہو رہا ہے میں اس حسنِ تعاون کیلئے مذکورہ کمیٹی کا بصمیم قلب شکر گذار ہوں۔ اللہ تعالیٰ میری اس حقیر کوشش کو قبول فرمائیں۔ اور اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

قمر عثمانی فاضل دیوبند

استاذ وقف دار العلوم دیوبند۔ ۵ نومبر ۱۹۸۸ء

شیخ سعدیؒ

ایک زندۂ جاوید شخصیت

جو خوش قسمت انسان موت کے بعد ہمیشہ کے لیۓ زندہ جاوید ہو جاتے ہیں ان میں شیخ سعدیؒ کا نام سر فہرست ہے۔ شیخ اپنے گوناگوں اوصاف اور کمالات کی وجہ سے زمانہ بھر میں مشہور ہیں۔ ان کی شہرت اور عظمت امتدادِ زمانہ سے اور بڑھی ہے۔ صدیاں گذر گئیں شیخ کی وفات کو مگر اوراقِ تاریخ میں اور قدردانوں کے دلوں میں وہ آج بھی زندہ ہیں بلاشبہ شیخ جیسی صفات کا حامل انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ شیخ اگر ایک طرف ہمیں بہترین شاعر کے روپ میں نظر آتے ہیں تو دوسری طرف لاجواب انشاء پرداز بھی ہیں، وہ فقیہہ بھی ہیں اور صوفی بھی ہیں، وہ رند خوش طبع بھی ہیں اور واعظ بے مثال بھی، ان کی گلستان بوستاں زمانہ گذرنے پر بھی اسی طرح شاداب، نظر افروز اور بہار بداماں ہیں جیسی ان کے زمانہ میں تھیں، کوئی ترقی یافتہ زبان نہ ہوگی جس میں دونوں کتابوں کے ترجمے نہ ہوئے ہوں۔ کوئی مہذب خطۂ زمین نہ ہوگا جہاں کے لوگ ان دونوں سے ناواقف ہوں۔

شیخ کی یہ دونوں کتابیں اگرچہ ان کی سیر و سیاحت اور سالہا سال کے

تجربات کا نچوڑ ہیں۔ تاہم ان ہی میں ان کی زندگی کی مختلف جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ شیخ نے بچپن میں اپنے والد کے زیر سایہ تربیت پائی۔ لیکن کچھ دنوں بعد ان کا انتقال ہوگیا جس سے شیخ کو قدرتی طور پر بہت صدمہ بھی ہوا۔ اور وہ زندگی کی ان آسائشوں سے بھی محروم ہوگئے جو ان کے والد کے زمانہ میں حاصل تھیں۔ وہ خود ایک جگہ اس حادثہ کا ذکر کرتے ہوئے درد بھرے انداز میں کہتے ہیں ؎

من آنگہ سر تاجور داشتم	کہ سر در کنار پدر داشتم
اگر بر وجودم نشستے مگس	پریشاں شدے خاطر چند کس
کنوں دشمناں گر برندم اسیر	نباشد کس از دوستانم نصیر
مرا باشد از درد طفلاں خبر	کہ در طفلی از سر برفتم پدر

"یعنی میں اس وقت آسائشوں کا تاج اپنے سر پر رکھتا تھا جبکہ میرا سر باپ کی شفقت بھری آغوش میں رہتا تھا، اس وقت اگر مکھی بھی میرے بدن پر بیٹھتی تھی تو اس سے بہت سے لوگ پریشان ہو جاتے تھے، اب اگر میرے دشمن بھی مجھ کو قید میں لے جائیں تو کوئی میرا دوست اور غم گسار نہ ہوگا۔ مجھ کو یتیموں کے درد کی خبر ہے اس لئے کہ بچپنے میں، میں بھی یتیم ہوگیا تھا۔"

پہلے زمانہ میں تربیت پر کس قدر دھیان دیا جاتا تھا، اس کا اندازہ خود شیخ سعدی کے ایک واقعہ سے لگائیے جو انھوں نے اپنے والد کا گلستاں میں لکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں باپ کے ساتھ رات کے وقت عبادت و تلاوت میں مشغول رہا۔ دوسرے لوگ سب سو رہے تھے۔ میں نے باپ سے کہا کہ یہ لوگ کیسے غافل سو رہے ہیں کسی کو اتنی توفیق نہیں کہ اٹھ کر دو رکعت ادا کرے۔ باپ نے فوراً تنبیہ کی کہ جانِ پدر! اگر تم بھی سوتے رہتے تو اس سے بہتر تھا کہ تم غیبت میں مبتلا

ہوتے. پہلے زمانہ میں عام دستور تھا کہ صاحبانِ علم و فضل دربار شاہی میں اپنے آپکو منسلک کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے اور وہ فی الواقعہ تھی بھی فخر کی بات کہ اس طرح سماج میں عزت بھی ہوتی تھی، اور معاش کا بہترین تکفل بھی، لیکن اس میں خرابی یہ تھی کہ شاہی ہمنشینوں کو بادشاہ کی بے جا خوشامد، جھوٹی تعریف اور مبالغہ آمیز قصائد سے کام لینا پڑتا تھا. شیخ کو بھی اس آزمائش کا سامنا کرنا پڑا، لیکن وہ یہاں بھی اپنی خودداری باقی رکھنے میں کامیاب رہے. انھوں نے جھوٹی تعریف سے اپنے آپ کو بچایا. ان کے ایک قصیدے کے دو شعر یہ ہیں ؎

سعدیا چنداں کہ میدانی بگو — حق نباید گفتن الا آشکار

ہر کرا خوف و طمع دربار نیست — از خطا باکش نباشد و ز کنار

"یعنی اے سعدی وہ بات کہنی چاہیے، جو حق ہو. اور حق کو چھپانا نہیں چاہیئے اسلیئے کہ جسکو دربار شاہی کی کوئی طمع یا خوف نہ ہوگا وہ کیوں کسی چیز سے ڈریگا"

اسی طرح ایک مرتبہ بغداد کا گورنر خواجہ علاؤ الدین اپنے بھائی کے ساتھ شاہی جلوس میں شریک تھا، راستہ میں شیخ سعدیؒ نظر پڑ گئے. فوراً گھوڑوں سے دونوں بھائی اتر گئے اور شیخ کی بیحد تعظیم کی، بادشاہ نے یہ دیکھا تو حیرت کے ساتھ پوچھا کہ یہ بوڑھا کون ہے جس کی تم نے اس قدر تعظیم کی ہے. دونوں نے عرض کیا کہ یہ اپنے وقت کا وہ مشہور انسان ہے جس کو سب سعدی کے نام سے جانتے ہیں. بادشاہ نے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا لیکن شیخ نے انکار کر دیا، جب زیادہ اصرار کیا تو شیخ مجبور ہو گئے. اور بادشاہ سے ملاقات کی، رخصت کے وقت بادشاہ نے نصیحت کی درخواست کی. شیخ نے یہ دو شعر نظم کر کے پیش کیئے ؎

شہے کہ حفظِ رعیت نگاہ می دارد — حلال باد خراجش کہ مزدِ چوپانی ست

دگرنہ راعیِ خلق ست زہر مارش باد — کہ ہر چہ می خورد از جزیتِ مسلمانی ست

"یعنی جو بادشاہ رعایا کی حفاظت کرتا ہے اس کے لئے ٹیکس لینا جائز ہے
اور جو بادشاہ رعایا کی حفاظت نہیں کرتا وہ ٹیکس اس کے لئے سانپ کے
زہر کے مانند مہلک ہے"، بادشاہ یہ سن کر رونے لگا، بے اختیار آنسو
جاری ہو گئے، اور شیخ سے بار بار پوچھتا تھا کہ میں راعی ہوں یا نہیں؟
شیخ نے کہا کہ اگر تو راعی ہے تو پہلا شعر حسب حال ہے اور اگر نہیں
تو دوسرا شعر۔

شیخ کے یہاں ظرافت کا عنصر بھی بہت زیادہ پایا جاتا ہے، ایک
جگہ لکھتے ہیں کہ مجھے کرایہ پر مکان کی ضرورت تھی، ایک یہودی پڑوس میں
رہتا تھا، وہ کہنے لگا کہ یہ مکان آپ ضرور لیجیے۔ میں اس کی خوبی سے واقف
ہوں، اس میں کوئی عیب نہیں، شیخ نے کہا کہ اس سے بڑا کیا عیب ہو گا کہ
آپ اس کے پڑوسی ہیں۔

اسی طرح ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک حجاز شریف سے آنیوالے حاجی نے
مجھے ہاتھی دانت کا کنگھا بطور تحفہ دیا، مجھے یاد آیا کہ ایکبار انھوں نے کسی بات پر
مجھے کتا کہا تھا، تو میں نے کنگھا یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ یہ ہڈی آپ
اپنے پاس رکھیے، براہ کرم آپ آئندہ مجھے کتا نہ کہیے گا۔

ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک شخص ایک مسجد میں زبردستی مؤذن بن گیا
لیکن اس کی آواز کچھ ایسی بھدی تھی کہ لوگ اس کو ناپسند کرتے تھے، مسجد کے
متولی نے ازراہ شرافت اس سے کہا کہ اس مسجد کا قدیم مؤذن موجود ہے
اس کی پانچ دینار تنخواہ مقرر ہے، تمہیں میں دس دینار دیتا ہوں تم دوسری
جگہ چلے جاؤ۔ وہ شخص چلا گیا۔ کچھ دنوں بعد متولی مسجد کے پاس آیا اور کہنے
لگا کہ تم نے ستم کیا مجھے وہاں بھیجدیا، وہ لوگ مجھے بیس دینار دے کر
علیحدہ کرنا چاہتے ہیں۔ متولی مسجد نے کہا کہ ابھی ہرگز نہ لینا، اسلئے کہ وہ عنقریب
پچاس دینار تک راضی ہو جائیں گے۔

اسی طرح ایک واقعہ لکھا ہے کہ میں اپنے شیخ ابن جوزی کی ہدایت کے خلاف موسیقی اور نغمہ کا ذوق رکھتا تھا اور جوانی کے جذبہ میں شیخ کی نصیحت کو نظر انداز کر دیتا تھا، یہاں تک کہ ایک شب میں ایک مجلس میں پہنچا جہاں گانے کا پروگرام تھا، گانا شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ نغمہ نگار بہت زیادہ مکروہ آواز والا ہے، اس نے گانا شروع کیا، اہل مجلس تمام چونک گئے اور سب کے سب بہت زیادہ مکدر ہوئے بالآخر کسی نہ کسی طرح گانا ختم ہوا تو میں نے گانے والے کو نذرانہ پیش کیا اور اپنی پگڑی اتار کر اس کے سر پر رکھ دی اور اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، دوستوں نے یہ رنگ دیکھا تو میری اس حرکت پر بہت زیادہ حیران ہوئے اور اس خلاف توقع معاملہ کی وجہ پوچھی، میں نے کہا کہ اس شخص کی کرامت مجھ پر ظاہر ہو گئی، اسلئے کہ میرے شیخ جس چیز کو مجھ سے نہ چھڑا سکے اس مغنی نے ایک رات میں اس سے توبہ کرا دی۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص بڑا پہنچا ہوا صاحب تصرف آدمی ہے۔

اسی طرح ایک مرتبہ یہ سفر میں تھے، فرنگیوں نے پکڑ لیا اور طرابلس میں خندق کھودنے کے کام پر مزدوروں کے ساتھ لگا دیا، بیچارے مجبوری میں صبر و شکر کے ساتھ اس مصیبت کو برداشت کرتے رہے، کوئی جاننے والے آ گئے، انھوں نے پہچان لیا، اور اپنے گھر لے آئے ان کے یہاں ایک لڑکی تھی اس سے ان کا نکاح کر دیا، لڑکی بہت زیادہ شوخ زبان تھی، اور ان سے ہر روز لڑتی تھی، ایک روز طعنہ دیتے ہوئے اس نے کہا تم وہی تو ہو کہ میرے باپ نے فرنگیوں کی قید سے ۱۰۰ دینار میں تمہیں چھڑایا تھا، شیخ سعدی نے جواب دیا کہ ہاں میں وہی ہوں کہ ۱۰۰ دینار میں فرنگیوں کی قید سے چھڑا کر

تیرے ہاتھوں گرفتار کرادیا۔

ایک عالم صاحب کی ایک لڑکی تھی جو کافی بدصورت تھی، کوئی شخص اس سے نکاح کیلئے آمادہ نہیں ہوتا تھا، مجبوراً ایک نابینا شخص سے اس کا نکاح کردیا انہی دنوں ایک حکیم اس شہر میں کہیں سے آیا جو اندھوں کو سوانکھا کرتا تھا....... لوگوں نے ان عالم صاحب سے کہا کہ تم اپنے داماد صاحب کا علاج کیوں نہیں کراتے، انھوں نے جواب دیا کہ اس خوف سے کہ کہیں میری لڑکی کو طلاق نہ دیدے۔

ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک مکروہ آواز والا خطیب بہت زور سے بلند آواز کے ساتھ قرآن شریف پڑھتا تھا، ایک نیک شخص اس سے ملے، انھوں نے پوچھا کہ تمہیں اس خطابت کا کیا مشاہرہ ملتا ہے، اس نے کہا کچھ نہیں، وہ بولے پھر تم یہ زحمت کیوں اٹھاتے ہو، اس نے کہا کہ محض خدا کیلئے، وہ بولے خدا کیلئے آئندہ مت پڑھنا

یہ چند نمونے ظرافت کے گلستاں بوستاں سے پیش کئے گئے ہیں جن سے شیخ کی ظرافت طبعی کا اندازہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ انھوں نے جو دیگر موضوعات پر لکھا ہے مثلاً اخلاق، قناعت، عفو و کرم، تواضع، تربیت، عشق و جوانی، ان سب واقعات اور قصص کے پردے میں بڑی کارآمد باتیں کہی ہیں جو اندازِ بیان کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ بڑی مؤثر بھی ہیں اور نتیجہ خیز بھی۔ ایک خاص بات شیخ کے یہاں یہ ہے کہ وہ کسی عنوان پر گفتگو کر رہے ہوں، اکثر اصلاحی مقصد ان کے پیش نظر رہتا ہے، وہ محض کسی بات کو قصہ کے طور پر بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اس سے مفید نتیجہ بھی نکالتے ہیں جس سے دل پر اثر ہوتا ہے اور انداز بیان کی دلکشی نتیجہ خیز ہوجاتی ہے۔

مثلاً وہ بوستاں میں ایک جگہ قصّہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شہر میں میرے سامنے ایک شخص چیتے پر سوار سامنے آگیا اور میں اس کی اس حالت کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا، وہ شخص سمجھ گیا کہ شیخ سعدی ڈر رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ تم یہ جو کچھ دیکھ رہے ہو اس سے متعجب مت ہو، یہ جانور میرے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا، اور اگر تم بھی خدا کے فرماں بردار بن جاؤ تو تمہاری بھی ہر چیز فرمانبردار بن جائے گی۔

اسی طرح ایک جگہ حضرت بایزید بسطامیؒ کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ عید کے روز غسل کر کے سڑک پر جا رہے تھے، کسی نے اوپر سے کچھ راکھ اور کباڑا نیچے ڈالا وہ سب ان پر آ کر گرا، یہ تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے گھر پہنچے، اور زبان پر یہ شکریہ کے کلمات تھے کہ خدا نے بڑا فضل فرمایا کہ محض راکھ پر بس ہو گئی ورنہ میرا جسم اور میں تو آگ کے قابل تھا۔

عابدوں اور زاہدوں میں ریاکاری اور خود بینی کا عیب زیادہ ہوتا ہے، شیخ جیسے تجربہ کار انسان سے یہ کمزوری چھپی نہیں رہ سکتی تھی اس لئے اس موضوع پر موقعہ بموقعہ حکایات کے پیرائے میں نکتہ چینی کی ہے۔

مثلاً ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک زاہد ایک بادشاہ کے یہاں مہمان ہوا، کھانے کا وقت آیا تو زاہد نے اپنی عادت سے کم کھایا اور نماز اپنے معمول سے زیادہ پڑھی، اس کے بعد جب اپنے گھر واپس گیا تو دوبارہ کھانا طلب کیا، اس کے لڑکے نے پوچھا کہ تم نے بادشاہ کی مجلس میں اچھی طرح کھانا کیوں نہیں کھایا، اس نے کہا کہ میں نے کھانا اس واسطے کم کھایا تاکہ بادشاہ کا حسن ظن میرے بارے میں زیادہ ہو جائے اسی لئے کھانا دوبارہ کھا رہا ہوں، لڑکے نے کہا کہ اگر وہاں کا کھانا

غیر معتبر ہے تو نماز بھی لوٹائیے اسلئے کہ وہ بھی نہیں ہوئی۔

پہلے زمانہ میں حق گوئی کم تھی، امراء اور سلاطین وغیرہ کی جھوٹی تعریفیں ہی اصل کمال سمجھی جاتی تھیں۔ شیخ نے اس سلسلہ میں لکھا ہے، چنانچہ انھوں نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص اپنے گدھے کو بری طرح مار رہا ہے، بادشاہ نے کہا کہ اس جانور کو اس طرح کیوں مارتا ہے، اس نے جواب دیا کہ میں اس کو اس لئے مار رہا ہوں کہ بادشاہ اس کو بیگار میں نہ پکڑ لے اور اس کے بعد اس کو خوب برا بھلا کہا، یہ سن کر بادشاہ اپنے پایۂ تخت واپس آگیا، صبح کو اس نے پولیس کے ذریعہ اس شخص کو بلا بھیجا، اس کے آنے پر بادشاہ نے اس کی گستاخی کی سزا دینی چاہی تو اس نے کہا ؎

نہ تنہا منت گفتم اے شہر یار — کہ برگشتہ بختی و بد روزگار

چرا خشم برمن گرفتی و بس — منت پیش گفتم ہمہ خلق پس

"یعنی آپ کیلئے بہتر صورت یہ ہے کہ اپنے ظلم سے ہاتھ کھینچیں یہ نہیں کہ بے گناہوں پر ظلم کریں"

اسی طرح ایک جگہ لکھا ہے ایک بادشاہ ایک فقیر کی بدگوئی سے پریشان ہوا، بادشاہ نے اس کو گرفتار کرا کر جیل میں ڈلوا دیا، فقیر نے کہا ؎

رسانیدن امر حق طاعت است — ز زنداں نہ ترسم کہ یک ساعت است

"یعنی حق بات کہنی ضروری ہے، قیدخانہ سے میں نہیں ڈرتا اسلئے کہ یہ چند روزہ ہے"

یہ بات بادشاہ نے سنی تو کہا چند روزہ نہیں ہمیشہ اس کو قید میں ہی رہنا ہوگا۔ فقیر نے کہا ؎

کہ دنیا ہمی ساعتے بیش نیست — غم و خرمی، پیش درویش نیست

"یعنی دنیا بھی چند روز سے زیادہ نہیں، غم اور خوشی بھی فقیر کے نزدیک کچھ نہیں ہیں"۔

بادشاہ نے سنا تو حکم دیا کہ اس کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے فقیر نے کہا:۔

من از بے زبانی ندارم غمے   کہ دانم کہ ناگفتہ داند ہمے

"یعنی مجھ کو بے زبانی کا کوئی غم نہیں، اسلئے کہ میں جانتا ہوں کہ خدا بے کہے بھی سب کچھ جانتا ہے"۔

اس قسم کی آزادگوئی کی تعلیم شیخ نے مختلف حکایات کے انداز میں دی ہے جو اس سے پہلے موجود نہیں تھی۔

حمد اور نعت کا مضمون سب ہی لوگ کتابوں کے شروع میں لکھتے ہیں، لیکن شیخ نے اس باب میں بھی اپنی انفرادیت کے جوہر دکھلائے ہیں، اور فصاحت و بلاغت کے وہ جادو جگائے ہیں کہ ذوق و وجدان جھوم جھوم اٹھتا ہے، اس سلسلہ میں ہر دو مضمونوں کی صرف ایک ایک مثال ملاحظہ کیجئے ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم   وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر   ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

"یعنی اے وہ ذات بے ہمتا کہ جو ہر قیاس و گمان سے ماوراء ہے ہم نے جو کچھ پڑھا اور سنا ہے اسکا خلاصہ یہ ہےکہ عمر تمام ہو گئی اور ہم ابھی تک تیری حمد کے نقطۂ آغاز سے بھی آگے نہیں بڑھے۔

نعت کے سلسلہ میں تو وہ مشہور عربی قطعہ ہے ہی کہ جو صحیح معنیٰ میں نعتیہ دواوین پر بھاری ہے ؎

بلغ العلیٰ بکمالہ   کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ   صلوا علیہ و آلہ

"یعنی آپ اپنے کمالات کی وجہ سے بلندیوں پر پہونچ گئے، اور

تاریکیاں آپ کے جمال کی وجہ سے دور ہو گئیں۔

آپ کی تمام عادتیں خوب تر ہیں آپ اور آپ کی تمام آل پر درود پڑھو۔ اگرچہ شیخ نے ان میدانوں میں خوب خوب داد فصاحت دی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اگر وہ صرف ان دونوں مثالوں پر ہی اکتفا کرتے اور کچھ بھی نہ لکھتے تب بھی یہ دونوں قطعے دفتروں پر بھاری رہتے۔ یہ شیخ کے اعجاز کلام کی انتہا ہے کہ بیان و زبان مضمون اور مفہوم کے اعتبار سے یہ قطعے آج بھی حمدیہ و نعتیہ لٹریچر کی جان ہیں۔ ایسا شیخ ہی کر سکتے تھے۔ قدرت نے یہ ملکہ یہ جوہر اور یہ غیر معمولی قدرت بیان انہی کو عطا فرمائی تھی کہ جس میدان میں نکل گئے معلوم ہوا کہ اسی میدان کے شہسوار ہیں کہ اہل علم نے سر دھنا، اہل دل نے قدر کی، اہل نظر نے آنکھوں سے لگایا، بادشاہوں نے عزت سے دیکھا، علماء نے تعظیم کی، صوفیاء نے سرمۂ بصیرت بنایا، بوڑھوں نے داد دی، جوانوں نے واہ واہ کی، غرض وہ ہر راہ سے گذرے اور جس راہ سے بھی گذرے وہاں سے دیدہ و دل کیلئے بہت کچھ لے کر آئے۔

شیخ اپنے وقت کے مزاج اور مذاق سے مجبور تھے جو انھوں نے اپنی گلستاں بوستاں میں عشق اور حسن کے باب قائم کئے اور بے تکلفی کے ساتھ بعض ایسے واقعات بیان کر گئے جو تہذیب سے گرے ہوئے ہیں ورنہ اس سے قطع نظر کر لی جائے تو گلستاں اور بوستاں یقیناً ایک ایسے گلشن بے خزاں کی مانند ہیں جس میں خزاں کی کبھی کوئی گنجائش پیدا نہیں ہو گی۔

علم و فن کی ترقی کے اعتبار سے دنیا کہیں سے کہیں پہونچی ہے مگر ان دونوں کتابوں کی آج بھی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، آج

ان میں وہی تروتازگی، وہی رعنائی، وہی دلچسپی موجود ہے جو کسی بھی بہتر سے بہتر کتاب میں ہو سکتی ہے۔

کسے معلوم تھا کہ چھوٹی سی عمر میں یتیم ہو جانے والا یہ بچہ کیا کچھ بن جائے گا۔ سعدی ہی کی زبان میں کہنا چاہیئے کہ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

* * *

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رح

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رح اپنے علم وفضل اپنے تقویٰ و طہارت بے نفسی اور للّٰہیت اور اپنی خدمات جلیلہ کی بناء پر رہتی دنیا تک یاد رہیں گے، آپ قصبہ نانوتہ میں ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام شیخ اسد علی تھا، ابتدائی تعلیم کچھ دنوں تک نانوتہ میں اور کچھ دنوں دیوبند میں مولانا مہتاب علی صاحب کے مکتب میں حاصل کی جو حضرت شیخ الہند کے تایا تھے، مولانا مملوک علی صاحب جو مولانا یعقوب صاحب کے والد اور اپنے وقت کے متبحر عالم تھے ان سے اکتساب علم کیا اور اس کے بعد حدیث شریف مولانا شاہ عبدالغنی صاحب سے پڑھی، شروع ہی سے ذہین نیک طبع اور پڑھنے کے شوقین تھے، اپنی جماعت اور ہم سبقوں میں ہمیشہ ممتاز رہتے، جس کتاب کا مطالعہ کرتے ذہن میں محفوظ ہو جاتی، اور جو کتاب سامنے آتی اسی کو پڑھ ڈالتے، مولانا مہتاب علی دیوبندی آپ کو علم کی بکری کہا کرتے تھے، خاکساری اور فروتنی آپ کی طبیعت و فطرت کے نمایاں جوہر تھے، ایک مرتبہ کسی موقع پر فرمایا کہ اس وضع نے مجھے رسوا کیا اگر یہ لفظ مولوی میرے ساتھ لگا نہ ہوتا تو اپنے آپ کو ایسا مٹا دیتا کہ کوئی یہ بھی نہ جانتا کہ قاسم نام کا کوئی شخص دنیا میں پیدا ہوا ہے، دیوبند میں حضرت حاجی عابد حسین

صاحب اور مولانا شیخ مہتاب علی صاحب اور شیخ نہال احمد صاحب وغیرہ نے جب مدرسہ قائم کیا تو اس کیلئے متفقہ طور پر مولانا قاسم صاحب کو بلایا گیا، مولانا کی تشریف آوری کے بعد دیوبند کے مدرسہ نے ترقی کی اطراف سے طلبائے دین آنے شروع ہوئے، مولانا کے اخلاص اور دوسرے رفقاء کار کی نیک نیتی اور بھرپور جدوجہد سے مدرسہ دیوبند نے دارالعلوم دیوبند کے نام سے شہرت حاصل کی اور ہزاروں لاکھوں لوگوں نے اس سے دینی فیض حاصل کیا اور انشاءاللہ کرتے رہیں گے، مولانا قاسم صاحبؒ نے بچپن میں خواب دیکھا تھا کہ میں اللہ میاں کی گود میں بیٹھا ہوا ہوں، حضرت کے دادا نے خواب سنا تو فرمایا اللہ تعالیٰ تمہیں علم عطا فرمائے گا، اور تمہارا شمار بڑے درجہ کے علماء میں ہوگا۔

شیخ وجیہہ الدین مولانا مظہر صاحب مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری بھی آپ کے اساتذہ میں ہیں۔

ایک مرتبہ خواب میں دیکھا میں کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور مجھ سے ہزاروں نہریں جاری ہیں، اس خواب کی تعبیر آج دنیا کے سامنے ہے، ہزاروں لاکھوں علماء اور مدرسے اور دینی ادارے دارالعلوم دیوبند کے نور سے منور ہیں، اور عالم میں علم دین کی روشنی پھیلا رہے ہیں اور دارالعلوم کا نور ہی ہے جس کو فیضان قاسمی کہا جاتا ہے، تاریخ اس پر گواہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے نام اور کام کو جو مقبولیت اور عظمت دنیا میں حاصل ہوئی، اسمیں مولانا قاسم صاحبؒ کے اخلاص ان کی دردمندی، ان کی للّٰہیت کو بہت بڑا دخل ہے، یہ آپ کے اخلاص ہی کی علامت تھی کہ آپ نے دارالعلوم سے اس وقت تک تنخواہ لینی گوارہ نہیں کی جبتک

آپ نے شادی نہیں کی، شادی کے بعد اہلِ شوریٰ کے بہت زیادہ اصرار پر آپ نے تنخواہ قبول فرمائی، احتیاط کا یہ عالم تھا کہ کبھی مدرسے کا قلم دوات استعمال کرتے تو ان کی دونی مدرسے میں دیدیتے کہ مدرسے کے مال میں ناجائز تصرف نہ ہو، مدرسے میں تہہ خانے بن کر تیار ہوئے تو بعض حضرات نے کہا کہ حضرت تہہ خانے میں دوپہر کو آرام فرمالیا کریں، آپ نے انکار فرمادیا کہ طلباء کیلئے ہیں ہمارے لئے نہیں، یہ بھی اخلاص ہی تھا کہ ایک مرتبہ بھوپال سے ایک معقول مشاہرے پر آپ کو بلایا گیا مگر آپ نے معذرت کردی، اسی اخلاص کی برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھوں پروان چڑھائے ہوئے اس مرکزِ علم کو پوری دنیا میں چمکایا، اور اس کی روشنی کو دور تک پھیلایا گویا یہ صرف رسمی مدرسہ ہی نہیں بلکہ یہ ایک ایسی فیکٹری ہے جس میں علماء تیار ہوتے ہیں اور ایسے لائق افراد تیار ہوتے ہیں جو عوام کی دینی قیادت کی ذمہ داری نبھا سکیں، مولانا قاسم صاحبؒ خود علم کے پیکر تھے، ان کے اخلاص نے علم کا جو سانچہ تیار کیا وہ ایسا موزوں ایسا مستحکم اور ایسا شاندار ہے کہ اس میں جو ڈھل گیا وہ کچھ سے کچھ بن گیا۔

حضرت مولانا قاسم صاحبؒ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے بیعت ہوئے، اور خوب باطنی فیض حاصل کیا، حضرت حاجی صاحب جو ہمارے تمام بزرگوں کے روحانی پیشوا اور روحانیت کے امام ہیں۔

وہ حضرت مولانا قاسم صاحب کے کمالات باطنی و علمی کے بہت زیادہ معترف تھے، بہت زیادہ مشہور ہے حضرت حاجی صاحب کا یہ جملہ کہ معاملہ برعکس ہوگیا، مولوی رشید احمد اور مولوی قاسم کو میری جگہ اور مجھے ان کی جگہ ہونا چاہیئے تھا، مطلب یہ کہ وہ مجھ سے بیعت ہوگئے

حالانکہ مجھے ان سے بیعت ہونا چاہیئے تھا، یہ اعتراف کمال کے ساتھ اپنےلیئے احساس عجز و انکساری کی واضح علامت ہے جو ہمارے تمام بزرگوں کا خاصہ رہی ہے، حضرت امیر شاہ خاں صاحبؒ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحب کی مجلس میں مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا تذکرہ ہو رہا تھا، اور انکے مناقب بیان ہو رہے تھے تو حضرت حاجی صاحبؒ نے حضرت مولانا نانوتوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا اسمٰعیل تو تھے ہی کوئی ہمارے اسمٰعیل کو بھی دیکھے۔ جہاں مرشد اور مسترشد دونوں باکمال ہوں وہاں روحانی عظمتوں اور باطنی رفعتوں کی کیسی کیسی منزلیں طے ہو جاتی ہیں اس کا اندازہ تو اہلِ نظر ہی لگا سکتے ہیں مولانا رفیع الدین صاحب فرماتے تھے کہ میں پچیس برس حضرت نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا لیکن کبھی بغیر وضو حاضر نہیں ہوا، میں نے انسانیت سے بالا ان کا درجہ دیکھا وہ شخص ایک فرشتہ مقرب تھا جو انسانوں میں ظاہر کیا گیا، حضرت نانوتویؒ کے والد بزرگوار نے ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحب سے شکایت کی کہ میرے یہی لڑکا ہے تم نے اسے خدا جانے کیا کر دیا ہے نہ نوکری کرتا ہے نہ کچھ اور، مجھے امید تھی کہ میری غربت اور تنگدستی کم ہوگی، اور مجھے اس سے سہارا ملے گا، حضرت حاجی صاحبؒ اس وقت تو خاموش رہے مگر بعد میں ان سے کہہ دیا کہ آگے چل کر ایسا ہوگا کہ بڑے بڑے لوگ اس کی عزت کریں گے، اور دنیا اس کے قدموں میں آئے گی اور اس کو یہ ٹھوکر مارے گا، جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی اور آپ کو اللہ نے وہ عظمت اور شہرت عطا فرمائی کہ ہر خاص و عام کی زبان پر آپ کا نام عزت کے ساتھ آنے لگا، اور دنیا آپ کے قدموں میں آئی مگر آپ نے اس کو ٹھکرا دیا، بطور تصدیق یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ ایک مرتبہ میرٹھ کے ایک

رئیس عبدالکریم ان کا نام تھا حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے ،
حضرتؒ نے اوّلاً ان کی طرف توجہ نہیں فرمائی ، بعد میں سلام ومصافحہ
کے بعد ان صاحب نے ایک معقول رقم حضرت کو پیش کرنی چاہی ، آپ نے
انکار فرمایا ، بہت زیادہ اصرار کے بعد وہ صاحب روپوں کی تھیلی
حضرتؒ کی جوتیوں میں رکھ کر چلے گئے ، حضرتؒ جب اٹھے تو پاؤں سے
تھیلی جھاڑ کر اور جوتے پہن کر تشریف لے گئے اور ایک صاحب سے
مخاطب ہو کر فرمایا کہ دنیا اور لوگ بھی کماتے ہیں مگر فرق یہ ہے دنیا کے
پیچھے وہ بھاگتے ہیں اور دنیا ان سے بھاگتی ہے ، اور ہمارا حال یہ ہے
ہم اس کو ٹھکراتے ہیں اور وہ ہمارے قدموں میں آتی ہے یہ کہہ کر وہ
تمام روپے مستحقین میں تقسیم کرا دیئے ، حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج
مراد آبادی جو ایک بڑے درجہ کے صاحب فضل وکمال بزرگ ہیں ان
کے سامنے جب ایک مرتبہ مولانا قاسم صاحبؒ کا تذکرہ ہوا تو آپ نے
فرمایا انھیں تو کم عمری ہی میں ولایت مل گئی ہے ، حضرت نانوتویؒ ایک
مرتبہ پنجاب کے ایک مقام پنجلاسہ میں مقیم ایک صاحب حال اور
صاحب کشف بزرگ راؤ عبدالرحمٰن کی خدمت میں حاضر ہوئے یہ حضرت
شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کے فیض یافتہ اور مجاز اور باکمال بزرگ تھے ان سے
مولانا قاسم صاحبؒ نے دعا کی درخواست کی ، انھوں نے فرمایا میں تمہارے
لئے کیا دعا کروں ، میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم
کے سامنے بخاری شریف پڑھتے ہوئے دیکھا ہے ، دلی میں ایک مجذوب
تھے حافظ عبدالقدیر نام تھا سب ان کو جانتے تھے ، مجذوبانہ باتیں کرتے
رہتے تھے ، ایک مرتبہ طالب علمی کے زمانہ میں حضرت نانوتویؒ بخاری شریف
ہاتھ میں لئے جا رہے تھے ، حافظ صاحب راستہ میں مل گئے بخاری شریف
ان کے ہاتھ سے لے لی اور چل دیئے آگے وہ اور پیچھے پیچھے حضرت

حافظ صاحب چلتے چلتے ایک بھڑبوج کی دوکان پر جا کر بیٹھ گئے، اور ورق الٹ پلٹ کرنے لگے اور ساتھ ہی من من کرتے جاتے، کچھ دیر بعد کتاب مولانا کو دیدی اور کہتے ہوئے چلے گئے جاتو بڑا عالم ہوگا، یہ آثار اور علامات بتلاتے ہیں کہ قدرت نے آپ کو علم و تقویٰ پاکی اور پاکبازی فقر و استغنا کی ایک تصویر بنا کر دنیا میں بھیجا تھا اور پہچاننے والے شروع ہی سے آپ کے ان اوصاف کو پہچان رہے تھے۔ بالائے سرش۔ زہوشمندی۔ می تافت۔ ستارۂ بلندی۔

شاملی کے میدان میں حضرت حاجی صاحبؒ کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف جہاد ہوا تو آپ کو سپاہ مجاہدین کا کمانڈر انچیف بنایا گیا انگریزوں کی منظم اور تربیت یافتہ فوج کے مقابلہ میں اگرچہ اس جہاد میں کامیابی نہ ہوسکی مگر انگریزوں کو کسی حد تک مسلمانوں کی مزاحمتی قوت کا اندازہ ہوگیا اور آئندہ جنگ آزادی کیلئے راستہ ہموار ہوا، آج ہندوستان کی مطمئن فضا میں سانس لینے والے چاہے ان علمائے مجاہدین کو یاد نہ رکھیں مگر تاریخ اور حقائق ہمیشہ ان کی جانبازیوں کو اپنے سینوں میں بسائے رکھیں گے۔

رسمی علم بہت سے لوگوں کے پاس ہوتا ہے مگر علم کی یہ حقیقت کہ وہ حامل علم کو اخلاق و اعمال کا جیتا جاگتا نمونہ بنادے یہ کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، اور یہ مقام جس کو مل جائے پھر اس کی زبان و بیان میں بھی وہ تاثیر پیدا ہوجاتی ہے جو دلوں کو متاثر کرے اور سینوں میں اتر جائے مباحثۂ شاہجہانپور میں عیسائیوں سے مناظرہ ہوا آخر میں سیرت پاک کے موضوع پر حضرت نانوتویؒ کی تقریر ہوئی تو لوگ دم بخود رہ گئے جیسے سکتہ ہوگیا یا کسی نے جادو کر دیا ہو، کہنے والے کہتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا تھا اب کسی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے ہیں،

اسی موقع پر ایک مشہور پادری نے کہا تھا کہ اگر تقریروں پر ایمان لایا جاتا تو یہ تقریر ایمان لائے جانے کے قابل تھی، حضرت کی تصانیف میں یوں تو متعدد کتب اپنی اپنی جگہ منفرد حیثیت رکھتی ہیں مگر سب سے اہم علمی خدمت، بخاری شریف آخری پانچ پاروں کا وہ حاشیہ ہے جو آپ نے اپنے استاد محترم مولانا احمد علی صاحبؒ کے حکم سے تحریر فرمایا، اہلِ علم جانتے ہیں کہ یہ پارے بہت مشکل بھی ہیں اور نہایت اہم بھی، امام بخاریؒ نے احناف پر جو اعتراضات کئے ہیں حضرت نانوتویؒ نے ان کے نہایت شافی مدلل اور مسکت جوابات دئے ہیں جو اہلِ علم کیلئے تحفۂ نادرہ ہیں، حضرت نے ایکمرتبہ جب کہ شورش پسندوں نے آپ کے خلاف فساد برپا کر رکھا تھا فرمایا کہ میں اکثر دیکھتا ہوں کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں اور اپنی رداء مبارک میں مجھے ڈھانپ لیتے ہیں اور کبھی اندر لے جاتے ہیں، اور کبھی باہر لاتے ہیں، سوتے جاگتے اکثر یہی منظر سامنے رہتا ہے کہ حضورؐ ردائے مبارک میں لئے ہوئے ہیں اور الگ کرنا نہیں چاہتے، مختلف حضرات نے اس کا مطلب اپنے طور پر سمجھا مگر حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ حضرت کی عمر ختم ہو چکی ہے اور حضورؐ کو دکھلانا مقصود ہے کہ جب لوگ اپنے ہو کر ایسے مفسد ہو گئے کہ خدا کے ایسے مقدس بندوں پر الزام لگانے سے نہیں شرماتے تو ہم بھی ایسی ہستی کو ایسے لوگوں میں رکھنا نہیں چاہتے، چنانچہ کچھ ہی دنوں بعد حضرت نانوتویؒ کا انتقال ہو گیا۔

حضرت نانوتویؒ کی وفات کے موقعہ پر حضرت کے مشہور ہم عصر سر سید مرحوم نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ اپنی جگہ بہت زیادہ اہم ہیں، ان اقتباسات سے اندازہ ہوگا کہ اربابِ نظر آپ کو کس وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے، اور آپ کی جامعیت اور فضل و کمال کے کس درجہ معترف

تھے وہ لکھتے ہیں۔ " بہت لوگ زندہ ہیں جنھوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو نہایت کم عمری میں دلّی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے، انھوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب مرحوم سے تمام کتابیں پڑھی تھیں، ابتدا ہی سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے انکے اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی　　　می تافت ستارۂ بلندی

زمانۂ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور رہے تھے ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا اور حاجی امداد اللہ کے فیض صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ رتبے کا دل بنا دیا تھا خود بھی پابندِ شریعت و سنت تھے اور لوگوں کو بھی پابند شریعت و سنت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی ان کو خیال تھا انہی کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کیلئے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی و کوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے وہ کچھ خواہش پیر و مرشد بننے کی نہیں کرتے تھے لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب میں ہزارہا آدمی ان کے معتقد تھے، اور ان کو اپنا پیشوا اور مقتدا جانتے تھے "۔

اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

" اس زمانے میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو بعض مسائل میں ان سے اختلاف کرتے تھے تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے ان کا پایہ اس

اس زمانہ میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیزؒ سے کچھ کم ہو اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا، مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحاق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا، درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے اور ایسے شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لئے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے"

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص باوجود اپنے علم وفضل کے اپنے ہم عصروں میں مقبول ومعتبر نہیں ہوتا ہے، ہم عصری بسا اوقات اعتراف کمال کیلئے مانع بن جاتی ہے، اور کم سے کم زندگی میں تو ایسا زیادہ ہوتا ہے، مرنے کے بعد چاہے محاسن ومحامد کا اعتراف ہو لیکن زندگی میں بہت کم ہوتا ہے لیکن اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ اس کے ہم عصر بھی اس کے فضل وکمال، اس کی عظمت ورفعت کے قائل ہوں تو یہ چیز اس شخص کی واقعی خوبیوں کی ایک دلیل اور علامت تصور کی جاتی ہے۔

سرسید مرحوم جو حضرت نانوتویؒ کے ہم عصر ہیں ان کے خیالات حضرت نانوتویؒ کے بارے میں جو اوپر نقل کئے گئے ہیں ان سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ محض مبالغہ پر مبنی نہیں ہے، بلکہ واقعی خوبیوں کا اظہار واقرار ہے۔ سرسید مرحوم طبقۂ علماء کے فرد نہیں ہیں، ان کی لائن دوسری ہے لیکن قدرت نے ان کو دل دردمند کے ساتھ وسعت فکر ونظر بھی عطا کی تھی ان کی نگاہ جوہر شناس نے حضرت نانوتویؒ کی شخصیت میں کیا دیکھا اس کی ایک جھلک ان تاثرات سے عیاں ہے۔

راقم الحروف تذکرہ نگار کو اس اظہار میں کوئی تامل نہیں کہ حضرت نانوتویؒ کے بارے میں جو کچھ ان سطور میں کہا گیا ہے وہ صرف آپ کے فضائل و مناقب کی ایک جھلک ہے، آپ کی عظمتِ شان کا صرف ایک اجمالی خاکہ ہے تفصیل میں جائیے تو:۔

"سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کیلئے"

اس عاشقِ رسول ﷺ نے تین مرتبہ زیارت بیت اللہ کا شرف حاصل کیا آخر کار علم و عمل کے اس پیکر نے جو دنیائے علم کا بادشاہ تھا مگر ذاتی زندگی میں درویش خدامست تھا، انچاس برس کی عمر میں ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو وصال فرمایا۔ جعل اللہ الجنۃ مثواہ۔

* * *

*

قطب عالم محدث کبیر

حضرت مولانا رشید احمد صاحب

(قدس اللہ سرہ)

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ہمارے اسلاف و اکابر کی جماعت میں ایک باعظمت مقام و مرتبے کے حامل ہیں جو باکمال انسان تاریخ میں اپنا نمایاں مقام ہمیشہ کیلئے محفوظ کر لیتے ہیں اور آنے والا زمانہ ایسے باکمال انسانوں پر فخر کرتا ہے، ایسے ہی منفرد اور مفتخر بزرگوں میں حضرت گنگوہی کا بھی شمار ہوتا ہے، ارباب علم وفضل نے آپ کو قطب عالم کہا ہے، محدث کبیر کہا، مرشد کامل کہا، مجاہد جلیل کہا، امام الاتقیاء کہا تو بالکل صحیح کہا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام القاب آپ کے قامت زیبا پر بالکل راست آتے ہیں۔

حضرت گنگوہیؒ نے طالبانِ علم دین کو حدیث وفقہ کا درس بھی دیا اور ایسے اخلاص اور کمال مہارت کے ساتھ دیا کہ علم وفضل کی ایک دنیا آباد ہوگئی ہزاروں علماء اور فقہاء آپ کی درسگاہ سے فیضیاب ہوکر صاحب علم وفضل بن گئے۔ آپ نے بیعت وارشاد کی

راہ سے ہزاروں لوگوں کو ہدایت و صداقت کی راہ پر لگا دیا ، آپ نے خانقاہی زندگی کو نئی آب و تاب بخشی اور ریاضت و محنت کے ذریعہ مقام سلوک میں گامزن ہو کر اپنے تعلق مع اللہ کے رشتہ کو مضبوط کیا ، آپ نے اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر ظلم و عدوان کے خلاف جہاد بھی کیا ، اور اس راہ میں آنے والی پریشانیوں اور مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت بھی کیا ، اور جہاد حق کے سلسلہ میں قید و بند کے مراحل سے بھی گذرے ، گویا ایک مومن کامل کی طرح نہ تسبیح سے بے نیاز ہوئے اور نہ تلوار سے نظر چرائی ، آپ نے ذکر و فکر کی مجلس کو بھی منور و مزین کیا اور وقت نے آواز دی تو میدانِ جہاد میں تیغ بکف ہو کر ظالم کے خلاف صف آراء ہو کر تیغ و سناں کا حق بھی ادا کیا ، اور معرکۂ حق و باطل میں میدان کارزار کو اپنے قدموں سے سرفراز اور سرخ رو بھی فرمایا۔

آپ کی پیدائش ۱۲۴۴ھ میں قصبہ گنگوہ ضلع سہارن پور میں ہوئی ، ابتدائی تعلیم حاصل کر کے ۱۲۶۱ھ میں آپ دہلی تشریف لے گئے ، یہاں مولانا مملوک علیؒ نانوتوی سے تعلیم حاصل کی ، حدیث شریف کے علاوہ دیگر علوم و فنون کی کتابیں آپ نے ان سے پڑھیں علاوہ ازیں محدث جلیل حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے دورۂ حدیث کی کتابیں پڑھ کر ۱۲۶۵ھ میں فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد کچھ دنوں سہارنپور میں تدریسی خدمت انجام دینے کے بعد اپنے وطن قصبہ گنگوہ میں ہی قیام فرمالیا ، اور یہیں طلباء اور مستفیدین کو فیضیاب فرمانے لگے ، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک آنکھوں کی بیماری کی وجہ سے مجبور نہیں ہو گئے ، ایک اندازے کے مطابق اس مدت میں تین سو سے زائد فضلاء اور علماء آپ کی درسگاہ

سے فارغ ہوئے۔

سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے شرف بیعت حاصل کیا، حضرت حاجی صاحب نے آپ کو اجازت و خلافت کی نعمت سے سرفراز فرمایا، حضرت نے مولانا گنگوہی کو اجازت بیعت عطا فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

"رشید احمد! حق تعالیٰ نے جس نعمت سے مجھے سرفراز فرمایا ہے وہ نعمت میں نے تمہیں بھی دیدی، ترقی دینا تمہارا کام ہے اور ہاں بھئی اگر تم سے کوئی مرید ہونے کی درخواست کرے تو انکار نہ کرنا اور مرید کر لینا، اور جس طرح تم نے میرے ہاتھ پر توبہ کی ہے، گناہوں سے بچنے کا نیکی کرنے اور شریعت کی پابندی کرنے کا اقرار کیا ہے جسے مرید کرو اس سے بھی اسی طرح اقرار کرا لینا اور مرید کر لینا"

آپ نے یہ نصیحت بھی فرمائی کہ:۔

"اگر کسی عورت کو مرید کرو تو پردے کے ساتھ مرید کرنا، کسی غیر عورت کو بے پردہ دیکھنا روا نہیں"

مولانا نے جواب میں عرض کیا حضرت بھلا مجھ سے کون مرید ہوگا حضرت حاجی صاحبؒ نے ارشاد فرمایا جیسا میں کہتا ہوں ویسا ہی کرنا۔

تھانہ بھون سے حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس سے رخصت ہو کر جب آپ گنگوہ تشریف لائے تو آپ کے دل کی دنیا ہی بدل چکی تھی شب بیداری اور ذکر و فکر میں آپ کا اکثر وقت گذرتا تھا، دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا کہ مولانا کے چہرے پر ایمان و یقین کا ایک عجیب نور چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔

مولانا کو اپنے شیخ سے اس درجہ محبت تھی کہ اگر دس پندرہ دن گنگوہ میں رہتے تو اس کے بعد فوراً بے قرار ہو کر تھانہ بھون حضرت

حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر زیارت کرتے

گنگوہ میں قطب دوراں شیخ عبدالقدوس قدس اللہ سرہٗ کا مزار ہے، مولانا نے یہ خیال فرماتے ہوئے کہ بزرگوں کی جگہ میں بھی برکت ہوتی ہے حضرت شاہ عبدالقدوس کی خانقاہ کو ذکر الٰہی کیلئے منتخب فرمایا، مزار مبارک کی دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بے حد کوڑا کرکٹ جمع ہو گیا تھا، مولانا نے اپنے ہاتھوں سے اس جگہ کو صاف کیا اور وہاں اللہ اللہ کرنے والوں کا ہجوم ہونے لگا، کچھ دنوں بعد حضرت نے اپنے پاس آنے والوں اور اللہ اللہ کرنے والوں کی سہولت کیلئے وہاں ایک سہ دری بنادی، خانقاہ کے سجادے حضرات جواب تک کچھ نہیں بولے تھے جب سہ دری بن گئی تو انھوں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ مولانا اس جگہ قبضہ کر لیں گے آپ سے یہ جگہ چھوڑ دینے کیلئے کہا مولانا نے فوراً وہ جگہ چھوڑ دی اور مسجد میں قیام فرمایا، کچھ دنوں بعد جب لوگوں کو اس کا احساس ہوا تو کچھ شہر والے اور آپ کے عزیز حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت ہمارے ساتھ شہر چلیں، اور جس مکان کو پسند فرمالیں اسی میں قیام فرمائیں، لیکن مولانا نے ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہیں جانے سے انکار کر دیا اور فرمایا یہ خدا کا گھر ہے اب مجھے یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔

کچھ عرصہ بعد وہ حضرات جنھوں نے مولانا سے شاہ عبدالقدوس قدس اللہ سرہٗ کا حجرہ خالی کرنے کیلئے کہا تھا انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا، اور ایک مجمع حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت سے بہت گڑگڑا کر التجا کی کہ حضرت گستاخی کو معاف فرمائیں، اور حجرہ شریف میں تشریف لے آئیں، ان حضرات کے بیحد اصرار

پر آپ نے پھر اس حجرہ شریف کو آباد فرمایا۔

طلباء علم دین کو حدیث شریف کا درس دیتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ انوار الٰہی کی بارش ہو رہی ہے، حضرت کے یہاں طالبین کا اور ذاکرین کا مجمع رہتا، حضرت کی ذات گرامی فیضان الٰہی کی ایک علامت بن گئی، جو آپ کے دربار میں پہنچ گیا ظاہری اور باطنی نعمتوں سے مالا مال ہو گیا۔

طلباء کا اس درجہ احترام کرتے کہ جس کی نظیر آج ملنی بہت مشکل ہے مہمانِ رسولؐ ہونے کے ناطے ان کی عزت فرماتے، ایک مرتبہ کسی طالب علم کو کھلے ہوئے برتن میں کھانا لاتے ہوئے دیکھا تو دریافت فرمایا کس کے یہاں سے کھانا لاتے ہو، اس نے نام بتلایا، وہ مولانا کے عزیز تھے، آپ نے آئندہ کیلئے وہاں سے کھانا لانے کو منع فرما دیا، اور فرمایا مستقل ہمارے ساتھ کھانا کھایا کرو۔

تواضع اور فروتنی آپ میں اسی طرح تھی جس طرح تمام اللہ والے بزرگ اس خوبی سے مزین ہوتے ہیں حق تعالیٰ شانہ جس کو بڑا بنانے ہیں اس میں تواضع کی شان پیدا فرما دیتے ہیں، ایکمرتبہ حدیث شریف کا سبق پڑھاتے ہوئے بارش آگئی، تمام طلباء کتابیں لے کر اندر بھاگے آپ نے جلدی سے سب کے جوتے اٹھا کر اندر رکھ دیئے، یہ بظاہر چھوٹے واقعات ہیں مگر ان سے حضرت کی بلند و بالا شخصیت کی جو تصویر بن کر سامنے آتی ہے وہ بڑی دلآویز اور خوبصورت ہے۔

ہندوستان پر انگریزوں کے تسلّط کے بعد جب انھوں نے ہندوستانیوں پر ظلم و ستم کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا تو ہر ہندوستانی کے دل میں انگریز کے خلاف غم و غصہ کی ایک آگ بھڑک

اٹھی، کم و بیش ہندوستان کے ہر حصے میں یہ آگ ہر طرف آہستہ آہستہ بھڑک رہی تھی۔ حضرات علماء کرام نے بھی اپنے فرض کو محسوس کرتے ہوئے انگریز کے خلاف علم جہاد بلند کیا، حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ حضرت نانوتوی حضرت گنگوہی حضرت حافظ ضامن صاحب شہید اس معرکۂ جہاد میں ذمہ دارانہ حیثیت سے پیش پیش تھے مشیت ایزدی کو یوں ہی منظور تھا ان بزرگوں کو اس مہم میں ناکامی ہوئی، انگریز نے انتقامی کارروائی شروع کی، گرفتاریاں شروع ہو گئیں، ذرا ذرا سے شبہ پر لوگوں کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا، ان مذکورہ بالا بزرگوں کو بطور خاص گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہ حضرات قافلۂ حریت کے سپہ سالار تھے، حضرت حاجی صاحب انگریزوں کی نگاہوں سے بچتے ہوئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے، حضرت نانوتوی کو آخر تک پولس پکڑنے میں ناکام رہی، حضرت گنگوہی کو گرفتار کر لیا گیا، تین دن تک کال کوٹھڑی میں بند رکھا اسکے بعد چھ مہینہ حوالات میں رہے، مقدمہ چلتا رہا، عام طور پر اندیشہ یہ تھا کہ انگریز حضرت گنگوہی کو پھانسی دیئے بغیر نہیں رہے گا اسلئے انگریزی حکومت مولانا کے اثر و رسوخ اور مقام بلند کی وجہ سے اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ انہی کو سمجھتی تھی، عام طور پر انگریز یہ سمجھتا تھا کہ عام ہندوستانیوں میں بغاوت کی آگ بھڑکانے والے یہی حضرات علماء ہیں، اور ان کا عوام پر بہت بڑا اثر ہے، اور انگریزوں کا ایسا سمجھنا کچھ غلط بھی نہیں تھا، حقیقت میں ان حضرات کی بزرگی اخلاص للّٰہیت دردمندی اور قومی ہمدردی اسی درجے کی تھی کہ عوام و خواص سب ان حضرات پر بھرپور اعتماد رکھتے اور پورا پورا اطمینان کرتے تھے۔

غرض یہ کہ حضرت گنگوہیؒ کے بارے میں بڑا خطرہ تھا کہ کہیں ان کو پھانسی نہ دیدی جائے اسی دوران ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا:۔

"رشید احمد کو پھانسی نہیں لگ سکتی، ابھی خدا کو اس سے بہت کام لینا ہے" "گفتۂ او گفتۂ اللہ بود"

حضرت حاجی صاحب کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی، ایک روز حاکم نے پیشی کے دوران پوچھا کیا تم نے حکومت کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائے تھے؟ مولانا نے تسبیح دکھا کر فرمایا "ہمارا تو بس یہی ہتھیار رہے"

حاکم نے کہا کیا تم نے فسادیوں کا ساتھ دیا؟ مولانا نے فرمایا "فساد سے ہمارا کیا واسطہ ہمارا کام فساد کا مٹانا ہے فساد کرنا نہیں ہے"

غرض یہ کہ چھ مہینے بعد آپ رہا کردیئے گئے، گنگوہ اپنے وطن آکر حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کو آباد کیا اور یہاں علم حدیث حاصل کرنے والوں کیلئے درسِ حدیث کا آغاز فرمایا۔

آپ کے مرشد حضرت حاجی صاحبؒ مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو آپ بھی زیارتِ حرمین شریفین کیلئے بیتاب ہوگئے، خدا کے گھر کی زیارت کے ساتھ ساتھ اپنے پیر کی قدم بوسی کا اشتیاق بھی دل میں موجزن تھا لیکن وسیلۂ ظاہری یعنی زادراہ آپ کے پاس نہیں تھا اسلئے اللہ سے دعائیں کرتے تھے..... حسن اتفاق کہ اسی زمانے میں رام پور کے ایک رئیس ڈپٹی عبدالحق صاحب نے حج کا ارادہ کیا، انھوں نے کچھ اور لوگوں کو بھی اپنے ساتھ لے لیا اور انھیں کو یہ خیال آیا کہ مولانا رشید احمد صاحب بھی اگر اس سفر میں ہمارے ساتھ ہوجائیں تو بہت اچھا ہو، انھوں نے مولانا سے عرض کیا، حضرت گنگوہیؒ نے

اس کو تائیدِ غیبی سمجھتے ہوئے ساتھ چلنے کا وعدہ فرمالیا۔ یہ مبارک سفر شروع ہوا۔ راستے میں مشکلات بھی پیش آئیں مگر اللہ والوں کی اس جماعت نے اسکو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے اس کو بھی انعامِ خداوندی سمجھا۔

ایک مرتبہ راستہ میں جہاز کو سخت طوفان نے گھیر لیا۔ تمام ساتھی گھبراگئے کہ خدا خیر کرے۔ حضرت گنگوہیؒ نے سب کو تسلی دی اور اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا ہم خود نہیں جارہے ہیں بلکہ بلائے ہوئے جارہے ہیں انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔

طوفان کا تمام زور ختم ہونے کے بعد، جہاز کے کپتان نے خوشخبری سنائی کہ طوفان کی وجہ سے جہاز نے ہفتوں کا فاصلہ گھنٹوں میں طے کرلیا ہے۔ یہ حضرت کی کھلی کرامت تھی کہ بظاہر جہاز کے لیے سنگین خطرہ بن جانے والا طوفانِ بلاخیز بھی ساحلِ مراد تک پہونچانے کا ذریعہ بن گیا۔

حضرت مکہ معظمہ پہونچ گئے، بیت اللہ کی زیارت بھی فرمائی اور اپنے مرشد حضرت حاجی صاحبؒ کی قدم بوسی بھی کی۔ یہ حضرت گنگوہیؒ کا پہلا سفرِ حج تھا۔ دوسرا سفرِ حج فرمایا تو مولانا قاسم صاحب، حکیم ضیاءالدین صاحب بھی ہمراہ تھے۔ یہ مبارک قافلہ مکہ معظمہ پہونچا تو حضرت حاجی صاحب استقبال کے لئے آبادی سے باہر تشریف لائے۔ یہ اس مبارک قافلے کی بڑی خوش نصیبی تھی حضرت حاجی صاحبؒ نے قافلہ کا استقبال فرمایا۔ ان کیلئے دعائے خیر فرمائی۔ اور پورے قافلہ کی اپنے یہاں دعوت کی۔ یہ حضرت کی طرف سے اس نورانی قافلے کی پذیرائی تھی۔ کیونکہ اس میں حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی رحمہا اللہ جیسے قابلِ قدر اور چہیتے مرید شامل تھے۔ یہی دونوں وہ قیمتی موتی ہیں جن کے بارے میں ایک مرتبہ مرشدِ خلائق

حضرت حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ "معاملہ الٹا ہو گیا مجھے مولوی قاسم یا مولوی رشید احمد سے مرید ہونا چاہیے تھا۔ یہ لوگ میرے مرید ہو گئے"۔

حضرت گنگوہی کی تمنا تھی کہ اپنے پیر کی خدمت میں رہ کر زیادہ سے زیادہ مستفید ہوں۔ اور ہندوستان واپس نہ ہوں مگر حضرت حاجی صاحب نے فرمایا:۔

"جی تو نہیں چاہتا مگر کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی ذات سے مسلمانانِ ہند کا بڑا فائدہ ہے مناسب یہی ہے ہندوستان واپس ہو جائیں"۔

تعمیلِ حکم کرتے ہوئے حضرت گنگوہی ہندوستان تشریف لے آئے اور یہاں آکر دینی اور علمی خدمات میں مشغول ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پُر آشوب دور میں آپ کو مسلمانوں کے لئے ایک صاحبِ نظر رہنما، صاحبِ دل مرشد ولی کامل عالم با صفا کے طور پر منتخب فرمایا تھا۔ چنانچہ آپ کی ذات گرامی دینی اور علمی فیضان کا ایک چشمۂ صافی بنی رہی اور خلقِ خدا آپ سے بہر حال اور بہر طور فیضیاب ہوتی رہی۔

در سراج آپ نے ۱۲۹۶ھ میں فرمایا۔

تمام ہی دینی مدارس سے آپ کو محبت تھی مگر دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور سے آپ کو بہت زیادہ تعلقِ خاطر تھا۔ آپ دارالعلوم دیوبند کے سرپرست بھی رہے۔ اور ہر طرح دارالعلوم کی فلاح و صلاح میں بھرپور کوششیں فرماتے رہتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے لئے قاسمی نسبت کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ مولانا حافظ احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (صاحبزادہ حضرت نانوتوی) کے دورۂ اہتمام میں جب ان کے خلاف کچھ لوگوں نے شورش کی تو حضرت گنگوہی نے بحیثیت سرپرست حافظ صاحب مرحوم کا بھرپور دفاع کیا اور حضرت کی باوزن شخصیت کے سامنے وہ اٹھنے والے فتنے گھٹ کر رہ گئے حضرت نانوتوی آپ کے پیر بھائی تھے۔ دارالعلوم کے بانی تھے ولی کامل تھے۔

اپنی سادگی، بے نفسی اور خدا ترسی میں قرنِ اولیٰ کے دور کے مسلمانوں کی یادگار تھے۔ حضرت گنگوہی کو اُن سے غیر معمولی تعلقِ خاطر تھا۔ اور ان کے واسطے سے حضرت کی اولاد سے بھی محبت تھی اور دارالعلوم دیوبند کے لئے ان کو بجد . . . بابرکت اور مفید تصور فرماتے تھے۔ اور تجربہ اور دارالعلوم دیوبند کی تاریخ نے ثابت کیا کہ حضرت نے جو کچھ سمجھا تھا وہ بالکل درست تھا۔ حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور اس کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کا دورِ اہتمام جیسا اور جتنا تابناک روشن اور بابرکت ہوا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

حاصل یہ کہ تصوف و طریقت کی مملکت کا بے تاج بادشاہ، ولی باصفا، محدّثِ دوراں، قطبِ وقت، مرشدِ کامل اپنے ایمان و یقین، علم و عمل، برکت و رحمت کی روح پر ور روشنی بکھیر کر بتاریخ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء کو جوارِ رحمت میں آسودہ رحمت ہو گیا۔

قصبہ گنگوہ میں آپ کا مزار پُر انوار آج بھی مرجع خلائق ہے۔

شیخ الہند

حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ کا نام نامی اور آپ کے عظیم دینی کارنامے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ "عیاں را چہ بیاں" بلاشبہ حضرت شیخ الہند رح ان نادرۂ روزگار لوگوں میں سے ایک تھے جن کے قابلِ فخر کارناموں سے تاریخ بنتی ہے۔ حضرت کے والد بزرگوار کا نام مولانا ذوالفقار علی ہے جو اپنے وقت کے ایک جید عالم اور صاحبِ کمال بزرگ تھے۔ عربی کے بہترین ادیب اور صاحبِ طرز انشاء پرداز تھے۔ دیوانِ حماسہ اور دیوان متنبی اور سبعہ معلقہ کی شرح تسہیل الدراسیہ، تسہیل البیان اور التعلیقات علی السبع المعلقات کے نام سے آج بھی مولانا کی بہترین علمی یادگار ہیں۔ جن سے اہلِ علم اور طلباء مستفید ہوتے ہیں۔ حضرت شیخ الہند ۱۸۵۱ء میں بریلی میں پیدا ہوئے جہاں بسلسلۂ ملازمت آپ کے والد بزرگوار مع اہل و عیال مقیم تھے۔ ابتدائی تعلیم اور قرآن پاک کی تعلیم ایک معمر اور باخدا بزرگ میاں جی منگلوری اور میاں جی مولوی عبد اللطیف صاحب سے حاصل کی۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے محترم چچا مولوی مہتاب علی صاحب سے پڑھیں۔ ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ میں دیو بند کے چند معزز

صلحائے وقت نے عربی مدرسہ کا اجرار فرمایا جو آگے چلکر دار العلوم بنا۔ پھر آپ کی تعلیم کا سلسلہ وہیں شروع ہوا۔ مولانا ملا محمود صاحب استاذ مقرر ہوئے اور محمود حسن نے بحیثیت طالب علم پڑھنا شروع کیا۔ سراپا اخلاص بزرگوں کی برکت تھی کہ پہلے ہی سال مدرسہ میں بیرونی طلبہ کا رجوع شروع ہوگیا۔ اکیس ۲۱ طالب علموں سے مدرسہ کا اجرار ہوا اور سال کے آخر تک اٹھتر ۷۸ طلبار کی جماعت ہو گئی۔ ۱۲۸۳ھ کے آخر میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مدرس اول کی حیثیت سے مدرسہ میں تشریف لے آئے۔ حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ نے دار العلوم میں اپنی تعلیم جاری رکھی۔ ۱۲۸۶ھ میں صحاح ستہ کی کتابیں حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحبؒ سے پڑھیں۔ دورۂ حدیث کی کتابوں کے ساتھ دیگر علوم و فنون کی کتابیں مکمل طور پر پڑھ کر ۱۲۸۹ھ میں فراغت حاصل کی اور ساتھ ہی معین المدرس ہو کر بعض کتابوں کا درس بھی دینے لگے۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ کی نظر انتخاب آپ پر پڑی۔ تا آنکہ پندرہ روپے ماہوار مشاہرے پر باقاعدہ مدرس مقرر ہو گئے۔ خداداد صلاحیت اور پختہ استعداد اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی۔ اس لیے ابتدائی اور اوسط درجہ کی کتابیں پڑھانے کے بعد حدیث کی اعلیٰ کتابیں ترمذی شریف اور بخاری شریف آپ نے پڑھانی شروع کی۔ طلبہ کا رجوع ہوا اور اس سے مدرسہ کی نیک نامی میں اضافہ ہوا۔ مکمل چوالیس برس تک مدرسۂ دیوبند کی مسندِ صدارت کو رونق بخشتے ہوئے علم دین کی جو خدمت مولانا نے کی وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ ایک متورع عالم شب بیدار باخدا بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ حق تعالیٰ نے جذبۂ حریت، جرأت، حق گوئی، قومی ہمدردی، دشمنانِ اسلام سے عداوت کا وصف بھی عطا فرمایا تھا۔ اس لیے اپنے اکابر کے نقشِ قدم پر

چلتے ہوئے انگریز جیسی جابر و قاہر حکومت جس کی اسلام دشمنی اور مسلم کشی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس کے خلاف آپ نے بھرپور اور متواتر جد و جہد فرمائی۔ حضرت حاجی صاحب، حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی رحمہم اللہ نے شاملی کے میدان میں انگریزوں سے جہاد کر کے جس سلسلہ کا آغاز کیا تھا، حضرت شیخ الہند نے اپنے جوشِ ایمانی اور جذبۂ جہاد سے اس سلسلۂ جہد و عمل کو پھر تازہ کیا۔ ۱۳۳۳ھ میں آپ اپنے مخلص رفقاء کے ساتھ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ شریف مکہ کی ترکوں سے بغاوت کے نتیجہ میں برٹش گورنمنٹ کے اشارے بلکہ حکم پر حضرت مولانا کو مع رفقاء کے گرفتار کر کے مالٹا بھیجدیا۔ مالٹا میں تین برس مقید رہے۔ یہاں کیسے کیسے حالات و حوادث پیش آئے حضرت نے اور حضرت کے رفقاء نے سخت حالات کا کس طرح پامردی سے مقابلہ کیا اور اپنے پائے استقلال میں جنبش نہ آنے دی، وہ ایک مستقل ایمان افروز اور ولولہ انگیز داستان ہے۔

حاصل یہ کہ حضرت نے انگریزوں کے اسلام دشمن طریق اور ظلم اور جبر کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔ اور سنتِ یوسفی کو زندہ کرتے ہوئے مالٹا کے قید خانہ کو اپنی مبارک ہستی سے آباد اور اپنے منور مشاغل سے مزین فرمایا۔ ریشمی رومال کی تاریخی تحریک آپ نے جاری فرمائی جس کا مقصد یہ تھا کہ افغانستان، ایران، ترکی متحد ہو کر ہندوستان پر حملہ کریں اور ہندوستان میں یہاں کے عوام بغاوت کر دیں۔ اور اس طرح برطانوی حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ۱۹۱۶ء میں یہ اسکیم راز فاش ہو جانے کی وجہ سے ناکام ہو گئی۔ مگر اس تحریک سے حضرت شیخ الہند رح کی بلند حوصلگی اور اولوالعزمی کا پتہ چلتا ہے کہ ایک نحیف الجثہ، لاغر اندام اور کمزور درسا درویش صفت انسان برطانیہ جیسی طاقت کو فنا کرنے اور اس کی حکومت کو تباہ کرنے کا عزم رکھتا ہے۔ اگر حضرت کی یہ اسکیم کامیاب ہو جاتی تو

ہندوستان بہت پہلے آزادی سے ہمکنار ہو چکا ہوتا۔ حضرت کے شاگردوں میں مولانا عبیداللہ سندھی اس تحریک کے انتہائی سرگرم اور بڑے اہم ممبر تھے۔ مولانا موصوف ہی تحریک کے اس پیغام کو لے کر مشکل ترین مسافتوں کو طے کرتے ہوئے افغانستان پہونچے تھے۔ ادھر حضرت شیخ الہندرہ نے حجاز شریف میں ترکی کے وزیر جنگ انور پاشا اور وزیر بحریہ جمال پاشا سے ملاقاتیں کیں۔ معاملہ آگے بڑھا تھا کہ حضرت مع اپنے رفقار مخلصین کے گرفتار کر لئے گئے۔ آج ہم اپنے ان بزرگوں کے صدقے میں آزاد ہیں، وطن آزاد ہے۔ جو لوگ ازراہِ تعصب علمار حق کے مجاہدانہ کارناموں اور آزادئ وطن کے لیے، ان کی غیر معمولی قربانیوں کا انکار کرتے ہیں یا چھپاتے ہیں وہ احسان فراموش اور کور چشم ہیں۔ ایسے لوگوں کو نہیں بھولنا چاہیے کہ علمائے کرام اور مجاہدین حق کا یہ پاکباز طائفہ اگر کفن بردوش ہو کر انگریزوں سے نبرد آزما نہ ہوتا تو آزادئ وطن کی بات خواب و خیال ہی رہتی۔ جذبۂ آزادی کے شعلہ کو ہندوستانی عوام کے سینوں میں فروزاں کرنے میں بلاشبہ ان ہی علمائے حق کا جہاد مسلسل مؤثر ذریعہ رہا ہے۔ حضرت شیخ الہند نے جزیرۂ مالٹا میں جو تکلیفیں برداشت کیں اس سے آپ کی صحت بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ کہنا چاہیے کہ آپ نے جہاد فی سبیل اللہ کا حق ادا کر دیا۔ اور اپنی زندگی کی تمام راحتیں اس راہ میں قربان کر دیں۔

پہلی جنگ عظیم کے موقعہ پر ہندوستان میں تحریکِ خلافت بڑے زور و شور سے اٹھی۔ اس کے پر جوش اقدامات نے اور ولولہ انگیز اور بھرپور جد و جہد نے پورے ہندوستان کو متاثر کیا۔ حضرت شیخ الہند رح مالٹا سے رہا ہو کر جب ہندوستان تشریف لائے تو آپ تحریک خلافت میں شریک ہو گئے۔ اس وقت انڈین نیشنل کانگریس ایک جماعت ضرور تھی لیکن بے اثر تھی۔ مہاتما گاندھی نے بڑی دور بینی اور سیاسی تدبر کا

ثبوت دیتے ہوئے کانگریس کو خلافت کمیٹی کے ساتھ ضم کر دیا. جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ آزادی میں نئی توانائی پیدا ہو گئی. پورا ہندوستان انگریزوں کے خلاف لڑی جانے والی اس لڑائی میں متحد ہو کر اس طرح صف آرا ہوا کہ برٹش سامراج کے پائے ہل گئے. پورا ملک انگریز کے خلاف ایک دہکتا ہوا لاوا بن گیا. حضرت شیخ الہند رح نے اس موقعہ پر ترکِ موالات کا فتویٰ دیا. جس سے پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف زبردست آگ بھڑک اٹھی یہاں تک کہ لوگ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی تک کو بند کرنے کے لیئے آمادہ ہو گئے. حضرت شیخ الہند رح مالٹا سے تشریف لائے تو آپ اس وقت بیمار تھے. اسی حالت میں آپ علی گڈھ تشریف لائے. اور علی گڈھ کی جامع مسجد میں آپ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح فرمایا. یہ تاریخ ساز ادارہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو وجود پذیر ہوا. بعد کو یہ ادارہ دہلی منتقل ہو گیا. آج یہ ادارہ ملک کے معروف ترین علمی اداروں میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتا ہے. اور اس ادارے نے ملک و ملت کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں. اسی جامعہ کا افتتاح کرتے ہوئے حضرت شیخ الہند رح نے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا وہ بھی تاریخی حیثیت کا حامل ہے.

حضرت شیخ الہند رح کا ایک نمایاں کارنامہ یہ بھی ہے کہ آپ نے علی گڈھ اور دیوبند کو باہم مربوط کرنے کی کوشش کی. اور آپ کی کوشش سے یہ بُعد بڑی حد تک ختم ہوا. غرض یہ کہ باوجود اپنی پیرانہ سالی اور بیماری کے آپ نے جدوجہد آزادی میں بھرپور قائدانہ کردار ادا کیا. پورے ملک کو جیسے آپ کے علم و فضل پر اعتماد تھا اسی طرح آپ کی قیادت و سیادت پر بھی مکمل بھروسہ تھا. آپ اپنی فراست و حکمت کی روشنی میں یہ سمجھتے تھے کہ انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے لیئے ہندوستان میں مکمل اتحاد ہونا ضروری ہے. سب جماعتیں اور قومیں مل کر ان سے

لڑیں گی تو انگریز یہاں ٹک نہیں سکے گا. اس لئے کہ اتحاد میں بڑی قوت ہوتی ہے. اسی خیال کے پیش نظر آپنے تحریک خلافت کو کانگریس کے ساتھ ملاکر جنگ آزادی میں ایک بہت مضبوط محاذ انگریزوں کے خلاف قائم کردیا. مشیت ایزدی کو اسی طرح منظور تھا کہ جب ملک پوری تیز رفتاری کے ساتھ آزادی کی منزل کی طرف گامزن تھا تو حضرت شیخ الہند رحؒ اپنے سفرِ زندگی کی آخری منزلیں طے فرمارہے تھے. یہ ضعیف وہ نوان مردِ درویش جو بظاہر چند ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ نظر آتا تھا، اس کے اسی پیکر نا تواں میں عزم و حوصلہ، ہمت و جرائت، شجاعت و بسالت کی بجلیاں کوندتی تھیں انگریز جیسی طاغوتی قوت بھی اس کی شعلہ فشانی اور آتش نوائی سے لرزتی تھی اور اس کے وجود کو اپنے لئے پیغامِ اجل تصور کرتی تھی.

آپ کی وفات کے بعد، ۲ سال گذرنے کے بعد آزادی ملی. لیکن قافلۂ آزادی کو اس کے صحیح رخ پر ڈالنے والے آپ ہی تھے. قیادت کا سہرا آج بھی آپ کے سر ہے. آپ آزادی حاصل ہونے کے وقت زندہ ہوتے تب بھی یہ سہرا آپ کے ہی سر بند ھتا.

حضرت کے فیض یافتہ لائق تلامذہ میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب، علامہ سید انور شاہ صاحب، حضرت تھانوی صاحب، مولانا عزیر گل صاحب، علامہ ابراہیم صاحب رحمہم اللہ وغیرہ جیسی بلند قامت ہستیاں ہوئی ہیں جو اپنی اپنی جگہ علم و فضل کی ایک مستقل کائنات اپنے اندر پوشیدہ کیے ہوئے تھیں. اور جنھوں نے اپنے اپنے طور پر علم دین کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں. بلاشبہ یہ سب فیضان حضرت شیخ الہند رحؒ کے حسنات و صالحات میں ہی شمار ہو گا. اس کے علاوہ اپنی تمام تر تدریسی اور سیاسی مشغولیات کے باوجود گرانقدر اور بیش قیمت کتابیں بھی آپ نے تحریر فرمائیں جو آج

بھی اہل علم و فضل کے لیے نعمت عظمیٰ اور قدر شناس لوگوں کے لیے گنج گراں مایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں ادلۂ کاملہ، ایضاح الادلہ، جہد المقل جیسی قیمتی کتابیں ہیں جو بعض معترضین کے مدلل جوابات پر مشتمل ہیں۔ الابواب والتراجم بخاری شریف سے متعلق حضرت کے بیش قیمت فوائد پر مشتمل ایک تحفۂ نادر ہے جو اہل علم کے لیے سرمۂ بصیرت سے کم نہیں۔ ترمذی شریف کی درسی تقریر جو حضرت کے تلامذہ نے ضبط کی وہ بھی حضرت کی بہترین علمی یادگار ہے۔ تصحیح ابوداؤد حدیث شریف کی مشہور کتاب ابوداؤد شریف کی متعدد مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخوں کی مدد سے اس کی مکمل تصحیح فرمائی جو حدیث کی بہت اہم خدمت ہے۔ قرآن پاک کا ترجمہ جو دراصل حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی کے ترجمے کی تسہیل ہے اس میں حضرت نے زبان کو بامحاورہ بناکر عام فہم کردیا ہے اور حاشیہ پر اس کے فوائد تحریر فرمائے ہیں۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً جو علمی مضامین بعض رسائل میں شائع ہوئے وہ بھی حضرت کے تبرکات سے کم نہیں ہیں باوجود تبحر علمی اور عظمت شان کے حضرت کے یہاں جو تواضع اور انکسار پایا جاتا ہے وہ آپ کی جلالت شان اور آپ کی بزرگی کو ظاہر کرتا ہے۔ من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ کی آپ زندہ مثال تھے۔ حق تعالیٰ نے آپ کو دینی اور علمی عزت و عظمت عطا فرمائی تھی مگر آپ فروتنی اور تواضع کو ہی اپنے لیے مایۂ افتخار سمجھتے تھے۔ اپنے بڑوں کا احترام تو جتنا حضرت کرتے تھے وہ ایک مثال ہی ہے اپنے ہمعصروں کے ساتھ ایسا معاملہ فرماتے کہ جیسے یہ بزرگ ہوں۔ تواضع اور فروتنی کے ذیل میں بطور مثال یہ واقعہ سنتے چلیے، کہ کانپور میں یکم تبہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے اصرار کرکے حضرت کا وعظ کرایا، وعظ میں حضرت مضامین عالیہ بیان فرما رہے تھے جو اہل علم کے لیے بطور خاص مفید تھا وعظ کے دوران مولانا لطف علی گڈھی جلسہ میں تشریف لے آئے۔ حضرت نے ان کو دیکھا تو فوراً وعظ ختم کردیا اور بیٹھ گئے۔ بعض احباب نے تعجب سے

پوچھا حضرت یہی تو وقت تھا وعظ کہنے کا اور آپ نے وعظ ختم فرما دیا. فرمایا ابتک خالصۃً لوجہ اللہ وعظ کہہ رہا تھا اور اب اظہار علم کے لئے ہو گا. اسی لئے میں نے وعظ موقوف کر دیا. اس واقعہ سے حضرت کی تواضع اور اخلاص فی النیۃ دونوں کا پتہ چلتا ہے. سب کچھ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنے کا انداز حضرت کی پوری زندگی میں ملتا ہے. حضرت کو اپنے مرشد واستاذ حضرت نانوتوی رح سے عشق کے درجہ کا تعلق تھا. آپ ہی سے شرف بیعت حاصل تھا. حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے بھی بذریعہ والا نامہ اجازت مرحمت فرمائی تھی. آپ بیعت فرمانے میں قدرے تامل سے کام لیتے تھے. وجہ اس کی بھی تواضع ہی تھی کہ آپ اپنے کو مرشد وشیخ کے درجہ کا آدمی نہیں سمجھتے تھے.

یہ اپنے وقت کا شیخ، علماء کا معلم، طلباء کا شفیق، مجاہد فی سبیل اللہ، شب بیدار، علم کا پیکر، متبع سنت، نمونہ تقوی زندگی بھر اپنے حسن عمل کے اجالے پھیلا کر ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو راہی فردوس بریں ہو گیا. جب تک علم وفضل کی دنیا آباد ہے جب تک تقوی کی عظمت باقی ہے جب تک جرأت وحق گوئی کا بھرم قائم ہے جب تک اخلاق واعمال کی قیمت برقرار ہے اس وقت تک حضرت شیخ الہند رح کا نام نامی سینوں اور سفینوں میں زندہ وتابندہ رہے گا.

فقیہ العصر عارف کامل

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی

(قدس اللہ سرہٗ)

ہوش کی آنکھ کھلی تو بچپن ہی سے جن بزرگوں کے تذکرے ان کے واقعات کان میں پڑے اور شروع ہی سے جن کی عقیدت دل میں بیٹھ گئی ان میں حاجی عابد حسین صاحب، حضرت نانوتوی صاحبؒ، حضرت مولانا یعقوب صاحب، حضرت شیخ الہند، حضرت شاہ صاحب، حضرت میاں صاحب، حضرت تھانوی، حضرت مفتی اعظم رحمہم اللہ جیسے اولیاء شامل تھے.

ولی کامل، عارف باللہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی انور اللہ مرقدہٗ کے واقعات بھی بارہا مختلف طریقوں سے کان میں پڑے تو ایک عجیب ایمان افروز طمانیت دل میں محسوس ہوئی. ضمیر نے گواہی دی ایسی بے داغ، ایسی صاف ستھری زندگی رکھنے والا شخص یقیناً ولی کامل، فقیہ، بالغ نظر اور شیخ طریقت ہو سکتا ہے. اس میں کوئی شبہ نہیں. جب بھی واقعات کی ترتیب سے ذہن میں کوئی تصویر بنی وہ بہت ہی سیدھے سادے معصوم صفت، متواضع، نرم گفتار، نیک نہاد، بالغ نظر

عالم اور نکتہ رس فقیہ کی بنی۔ طبیعت میں پیار ربھری عقیدت بے ساختہ ابھری۔
حضرت مفتی اعظم نے دارالعلوم ہی میں تعلیم حاصل کی اور تعلیم مکمل کرکے میرٹھ میں تدریس کا سلسلہ جاری فرمایا
وہاں علمی مشغلہ کے ساتھ ساتھ سلوک و معرفت کے مدارج بھی طے فرمائے
علم دین کے طلبہ بھی مستفید ہوئے۔ اور راہ سلوک کے طالبین بھی فیضیاب
ہوئے۔ عوام و خواص کو آپ کی ذات سے نفع ہوا تو لوگوں کے قلوب میں
آپ کی محبت و عقیدت روز افزوں ہوتی گئی۔ ۱۳۵۹ھ میں دارالعلوم میں
تشریف لے آئے۔ اور نائب مہتمم کی حیثیت سے فرائض انجام دینے لگے۔
اب تک دارالعلوم میں مستقل اور باضابطہ دارالافتاء نہیں تھا۔ استفتاء
آتے تو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جوابات دیدیا کرتے تھے۔ آپ کے
علاوہ دوسرے حضرات اساتذہ بھی یہ خدمت انجام دیتے تھے مگر کوئی باضابطہ
ادارہ اور کارِ افتاء کی منظم اور مربوط صورت نہیں تھی۔ کام بڑھا اور ضرورت
محسوس کی گئی تو حضرت قطب العالم حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء پر
حضرت مفتی اعظم کو باقاعدہ مفتی کے منصب پر فائز کرکے دارالافتاء کا
باقاعدہ آغاز کردیا گیا۔ تقریباً آپنے چالیس برس اس منصب جلیل کو زینت
بخشی اور اس عرصہ میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں فتاوی آپ نے تحریر فرمائے۔
اللہ تعالیٰ نے علم و عمل کے ساتھ تفقہ فی الدین کی جو دولت خاصہ آپ کو عطا
فرمائی تھی سیدھے سادھے الفاظ میں اختصار مگر جامعیت کے ساتھ جواب
دینے کا جو ملکہ قدرت نے ودیعت کیا تھا پھر اس پر مستزاد آپکی للہیت اور
نیکی تھی کہ مسئلہ پوچھنے والے کی تسلی اور تشفی ہوجاتی تھی۔
فتاوی میں مسائل کے معیار کے مطابق گفتگو فرماتے۔ عام آدمی کے لئے
ہلکے پھلکے الفاظ اور سیدھے سادھے انداز میں بیان فرماتے۔ پوچھنے والا
اگر صاحب علم ہوتا یا دلیل اور حوالہ طلب کرتا تو عربی عبارت اور حوالہ بھی
دیدیتے تھے۔ مسائل کا اور فقہ سے طبعی مناسبت اور ممارست کی وجہ سے

بڑے بڑے الجھے ہوئے اہم مسائل جن میں علمار طویل غور و تفحص اور مراجعت کتب کے بعد کسی حل تک پہونچیں حضرت مفتئ اعظم بتوفیق خدا بادنیٰ تشی اس کو حل فرما دیا کرتے۔ فتاویٰ دار العلوم کا مطالعہ اس کی شہادت دیتا ہے۔ دل کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو پاک سیرت نیک طبیعت فرشتہ خصلت بنایا تھا تاکہ ایک دنیا کے آپ کے پاکیزہ کردار اور نافع علم کی روشنی میں ہدایت کی راہ پاسکے (ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء) جب تک اللہ کو منظور ہوگا دار العلوم کے دار الافتار سے فتاویٰ کی خدمت جاری رہے گی اور عام مسلمان اس سے فیضیاب ہوتے رہیں گے۔ مگر اس عظیم الشان دینی خدمت کا آغاز اور اس کی مبارک بسم اللہ آپ کی ذات گرامی سے ہوئی، یہ شرف اولیت صرف آپ کے لئے مخصوص ہے۔ آپکے تحریر کردہ فتاویٰ علمار کی نظر میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ کسی مسئلہ میں آپ کا اسم گرامی آجانا اس کی ضمانت ہے کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، نہ دلیل کی حاجت ہے، نہ مراجعت کی ضرورت۔ گویا آپ اپنی ذات میں چلتا پھرتا دار الافتار تھے۔ جب چاہا کوئی بھی مسئلہ بلا تکلف پوچھ لیا۔ یہ آپ کا استحضار علمی تھا کہ مراجعت کے بغیر آپ مسئلہ تحریر فرماتے اور اس کی صحت میں کبھی فرق نہ آتا۔ یہ آپ کی کرامت کہیے کہ جسطرح لاکھوں مسلمانوں نے آپ کے فتاویٰ سے دینی رہنمائی حاصل کی آپکے بعد بھی لاکھوں مسلمان اس قیمتی ورثہ سے مستفید ہو رہے ہیں۔ کیسے سچے اور اچھے تھے یہ بزرگ زندگی میں بھی لوگوں کے لئے رحمت اور بعد میں بھی ان کے لئے فیض رساں، الدین یسر کے مصداق حضرت مفتئ اعظم مسائل میں سہولت اور آسانی والا رخ اختیار فرماتے تھے۔ تاکہ عمل میں سہولت ہو اور شریعت پر عمل خوش دلی کے ساتھ ہو سکے۔ چند سطروں یا چند لفظوں میں ایسا تسلی بخش جواب عطا فرماتے کہ ہر شخص آسانی سے مسئلہ سمجھ جائے۔ فتاویٰ دار العلوم

میں سادگی اور سہل نگاری کی یہ شان ایک ایک حرف میں ظاہر ہے۔ شان یہ ہیکہ نہ کہیں تشنگی باقی رہتی ہے نہ کہیں جی گھبراتا ہے۔ بات دل میں بیٹھتی اور سمجھ میں آتی ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپکو منصب افتاء کے لیے ہی بنایا تھا۔ اور وہ تمام محاسن اور اوصاف اور تمام خوبیاں آپ میں جمع کردی گئی تھیں جو ایک باکمال صاحب علم و خیر مفتی میں ہونی چاہیے۔ یہی آپ کی شخصیت کا امتیاز ہے۔ اسی آئینۂ کمال میں دنیا نے آپ کے دوسرے کمالات کا مشاہدہ کیا، خوفِ خدا، خدمتِ خلق، تواضع اور بے نفسی جیسے اوصاف سے بھی آپکی زندگی مزین تھی۔ دنیا کی بے ثباتی کس طرح ہر وقت پیشِ نظر رہتی تھی، اس کا اندازہ اس سے لگا کر آپ اپنی مسجد کے حجرہ میں قیام فرماتے تھے۔ وہاں جب آرام فرماتے ہمیشہ پاؤں سکوڑ کر اور سمیٹ کر لیٹتے تھے ایک صاحب نے جب آپ سے اس سلسلہ میں پوچھا تو آپ نے فرمایا بھائی یہ دنیا پاؤں پھیلا کر سونے کی جگہ نہیں پاؤں پھیلا کر سونے کی جگہ تو قبر ہے۔ یہ عمل اور یہ حال اسی شخص کا ہو سکتا ہے جس کی نظر میں دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی فنائیت ہمہ وقت پیشِ نظر رہتی ہو۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ کُنْ فِی الدُّنیا کاَنَّکَ غریب او عابر سبیل ہ دنیا میں اجنبی یا مسافر کی طرح رہو۔ حضرت مفتی اعظم کا اُسوہ بتاتا ہے کہ آپ پوری طرح اس پر عامل تھے۔ زندگی اور اس کی ناپائداری دنیا اور اس کی بے وقعتی عیشِ زندگی سے بے نیازی آخرت کا فکر اور استحضار یہ سب باتیں حضرت مفتی اعظم کے یہاں باہم اس طرح ملی جلی نظر آتی ہیں کہ ان کی ترتیب سے ایک مومن قانت کی بڑی ایمان افروز تصویر ابھر آتی ہے۔ ایک شب قرآن پاک کی آیت لیس للانسان الّا ما سعیٰ ذہن میں آئی اس کے معنیٰ میں غور شروع کیا تو یہ اشکال پیدا ہوا کہ اس آیت شریفہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کسی انسان کے لیے کسی دوسرے انسان کی کوشش مفید اور کارآمد نہ ہوگی، اور احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہیکہ

دوسرے کی سعی بھی کام آتی ہے، جیسے ایصالِ ثواب کے ذریعہ میت کو نفع پہونچنا اور انبیاء اور شہداء وغیرہ کا شفاعت کرنا اور اس کا دوسرے کے حق میں نافع ہونا، تو آیت اور حدیث میں تضاد نظر آتا ہے۔ اس میں تطبیق کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آئی تو ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ اگر ایسی حالت میں انتقال ہوگیا تو حال یہ ہوگا کہ قرآن کریم کی ایک آیت پر میرا ایمان کمزور ہوگا۔ اور یہ بات تشویش کی ہے۔ چنانچہ اسی حالت میں پاپیادہ گنگوہ کے لئے چلدیئے۔ دیوبند سے چلکر صبح کے قریب گنگوہ پہنچے۔ قطب العالم حضرت گنگوہی (قدس اللہ سرہ) تہجد کی وضو فرمارہے تھے۔ مفتی صاحب نے سلام عرض کیا اور کہا عزیز الرحمٰن آیا ہے۔ حضرت گنگوہی نے تعجب سے اس وقت آنے کی وجہ پوچھی تو آپ نے پیش آمدہ اشکال بیان فرمایا۔ حضرت نے وضو کرتے ہوئے اسی وقت جواباً فرمایا یہاں سعی ایمان مراد ہے۔ یعنی آیت کا منشاء یہ ہے کہ ایک شخص کا ایمان دوسرے کے کام نہیں آئے گا کہ ایمان ایک لائے اور نجات دوسرے کی ہوجائے۔ اس لئے آیت اور حدیث میں کوئی تعارض نہیں۔ حضرت مفتی اعظم کا فرمانا تھا کہ حضرت گنگوہی کے اس جواب سے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی حجاب سامنے سے ہٹ گیا ہے۔
یہ واقعہ بھی آپ کی للٰہیت، طلبِ علم اور خوفِ آخرت پر دلالت کرتا ہے۔ دیوبند سے گنگوہ تک پیدل رات میں سفر کرنا صرف خوفِ آخرت کی وجہ سے یقیناً بزرگی کی روشن علامت ہے۔ یہ خوف وخشیت ایک عالم ربانی کی ہی شان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔

حضرت مفتی اعظم کے مکان کے متصل ایک بڑی بی رہتی تھیں۔ امان خوب ان کا نام تھا۔ مفتی صاحب ان کی خدمت اور راحت رسانی کا خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ برسات کے موسم میں انھوں نے کہا عزیز الرحمٰن

چھت ٹپک رہی ہے مٹی ڈلوانی ہے۔ حضرت نے مٹی منگوائی اور پھر خود ہی بارش میں ان کی چھت پر اس کو پھیلا دیا۔ بارش میں بھیگ گئے بخار آ گیا مگر بڑی بی کو یہ پتہ نہیں ہوا کہ مٹی کس نے پھیلائی۔

آپ کا معمول تھا روزانہ عصر بعد اپنے محلہ میں رہنے والی غریب بیوہ عورتوں کے دروازے پر جاتے، اور پوچھتے کہ کسی کو کچھ بازار سے منگانا ہے۔ وہ اپنی ضرورت کی چیزیں بتا دیتیں اور پیسے دیتیں۔ مفتی صاحب بازار سے جا کر سب سودا سلف خریدتے، اپنے رومال میں باندھتے اور گھروں پر پہونچا دیتے۔ یہ واقعات پتہ دیتے ہیں کہ خود پسندی، خود بینی عجب وغیرہ سے آپ کی طبیعت پاک تھی۔ سبق میں تقریر فرماتے تو نہایت دھیمے اور ہلکے پھلکے انداز اور الفاظ میں فرماتے۔ اندازِ بیان اس کی شہادت دیتا کہ بولنے والا بے نفسی، تواضع اور خاکساری کا پیکر ہے۔ سبحان اللہ آپ نے جتنا خود کو اللہ کے لیے نیچا کیا اللہ نے اتنا ہی ان کو اونچا کیا۔ ان کے اچھے نام اور کام کو چمکایا۔ حدیث میں ارشاد ہے۔ مَنْ تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ۔ جس نے تواضع اختیار کی اللہ کے لئے، اللہ اسکو بلند فرماتا ہے۔ آج پوری علمی دنیا آپ کی علمی عظمت کی معترف اور آپ کے محاسن و محامد کی گرویدہ و مدح خواں ہے۔ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام آں۔

اوپر حضرت مفتی اعظم کی معصومانہ زندگی کے جن اجمالی واقعات کا تذکرہ ہوا، ان کو ذہن میں رکھیے، اور یہ بھی دیکھیے حدیث شریف میں آیا ہے، الخلق عیال اللّٰہ فاحب الخلق الی اللّٰہ مَن احسن الی عیالہ۔ تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ پس مخلوق میں اللہ کے نزدیک پسندیدہ وہ ہے جو اس کی عیال کے ساتھ بہترین سلوک کرے۔ طریقت و تصوف کا حاصل بھی خدمتِ خلق ہی ہے۔ طریقت بجز خدمتِ خلق نیست۔

حضرت مفتی علام کے یہاں یہ پہلو بہت نمایاں ہے۔ آپ کے دیکھنے اور جاننے والے آپ کی سادگی اور نیکی خدمتِ خلق کے واقعات عقیدت و محبت سے دہراتے ہیں۔ اور آپ کی عزت و عظمت کو دلوں میں جگہ دیتے ہیں۔ حضرت ممدوح فطرۃً ہی پاک باطن تھے۔ اس پر حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب نور اللہ مرقدہٗ جیسے روشن ضمیر، پاک باطن، مرشد کامل کی تربیت و تعلق بیعت نے اور بھی آپ کی طبیعت کو جلا بخشی۔ حضرت شاہ صاحب رہ شیخ وقت، صاحبِ تصرف بزرگ اور دار العلوم دیوبند کے مہتمم ثانی تھے۔ بیعت کے بعد حضرت مفتی صاحب پر کچھ رنگ ایسا چڑھا کہ ذکر و فکر، توجہ الی اللہ، یکسوئی اور خلوت پسندی محبوب و مرغوب ہو گئی۔ تمام دنیاوی تعلقات اور علائق سے ایک گونہ تنفر اور استغنا ہو گیا۔ آپ کے والد بزرگوار اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے حضرت شاہ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت، عزیز الرحمٰن کو آپ نے جس راہ پر لگایا ہے اس کے مبارک ہونے میں کلام نہیں اور اس کو چھڑانا بھی نہیں، مگر یہ چاہتا ہوں کہ بال بچوں کی طرف بھی اس کی توجہ رہے۔ حضرت شاہ صاحب کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ آپکی اولاد ماشاء اللہ اور بھی ہے ان کو آپ جس مشغلہ میں چاہے لگا دیں۔ مگر اس کو تو بس اسی کام کے لئے رہنے دیں۔ والد بزرگوار خاموش ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے مفتی علام کو علم و معرفت کی کیسی کیسی نعمتوں سے نوازا وہ ظاہر ہے۔ روحانی بلندی اور تصرف باطنی روشن ضمیری کی بیش بہا دولت آپ کو عطا فرمائی جو کسی ولی کامل کی ولایت کی علامت ہوتی ہے مختصر سا ذکر اس کا بھی سن لیجئے۔ دیوبند میں حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کے والد بزرگوار کی قبر سے ہر جمعرات کو تلاوتِ قرآن کی آواز آتی تھی، جس کی وجہ سے لوگوں کا وہاں ہجوم ہونے لگا۔ ظاہر ہے اس سے آگے چلکر لوگوں کے عقائد متاثر ہونے اور بعض خرابیوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا!

حضرت مفتی علام وہاں پہنچے اور وہاں جاکر آپ نے فرمایا کیوں لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کر رکھا ہے اس کے بعد وہ آواز آنی بند ہو گئی۔ حضرت مفتی علامہ کے والد ماجد حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ بیمار ہو گئے۔ بیماری نے شدت پکڑی اور وقت موعود آپہنچا۔ شدید کرب اور بے چینی آپ کو لاحق ہوئی سب لوگ پریشان اور متفکر تھے۔ مولانا نے اپنے ولد صالح کو بلایا اور فرمایا عزیز الرحمٰن تو نے میرے واسطے اب تک ایک انگلی نہیں اٹھائی۔ غالباً اشارہ اس طرف تھا کہ دعا نہیں کی۔ مفتی صاحبؒ سنا متأثر ہوئے اور والد کی چارپائی سے موڑھا ملا کر بیٹھ گئے۔ اور سر پر رومال ڈال لیا متوجہ ہوئے۔ آہستہ آہستہ یہ بے چینی ختم ہو گئی۔ فرحت و بشاشت چہرے پر کھلنے لگی۔ نہایت سکون اور طمانیت کے ساتھ پاس والوں سے باتیں کرنے لگے۔ اور اسی بشاشت کی کیفیت میں کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے انتقال فرمایا تغمدہ اللہ برحمتہ۔ حدیث شریف میں آیا ہے علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل۔ (میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کے مانند ہیں)

اسلام کی صداقت اور حقانیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس میں ایسے ایسے باعظمت باکمال صاحب علم و فضل علماء، صلحاء، اتقیاء، اولیاء ہر دور میں ہوتے رہتے ہیں۔ جن کے اخلاق و اعمال کو دیکھ کر خدا کی قدرت کا احساس ہو۔ خدا یاد آئے۔ اچھے اخلاق اور پاکیزہ اطوار کا نمونہ ان کی زندگیوں میں ملے۔ وہ لوگوں کے لئے ہدایت کی روشنی اور فیض کا چشمہ بنیں۔ وہ علم نبوت اور نور رسالت کو دوسروں تک پہونچائیں۔ انکی سیرت و کردار میں علم و روحانیت کی چمک اور کشش ہو۔ قلوب ان کی طرف کھنچیں اور مانوس ہوں، ہم اپنے اسلاف کی زندگیوں میں یہ شان اور یہ خوبی دیکھتے ہیں۔ حضرت مفتی علامہ جن کا ذکر خیر ان سطور میں ہو رہا ہے ان کے یہاں بھی یہ انداز اور یہ ادائے مومنانہ ملتی ہے۔ یہاں مختصر سا تذکرہ ہی مقصود ہے اور حصول سعادت کی

غرض سے ہی یہ سطریں عرض کی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے۔ حضرت مفتی علامہ جیسے صاحب اوصاف بزرگ پر قلم اٹھانے کا حوصلہ کسی ایسے ہی شخص کو ہو سکتا ہے جو ان کے کمالات کا صحیح ادراک کر سکتا ہو، ان کے علم و عمل کی جہات کا احاطہ کر سکتا ہو اور ان کے مقام بلند تک جس کی نظر جا سکتی ہو ایسے نیک بندوں اور بزرگوں کے تذکرے سے بھی ایمان میں تازگی روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مضمون میں ایک خواب نقل فرمایا ہے۔ مولانا اشتیاق احمد صاحب دیوبندی کے حوالہ سے وہ بلفظہ یوں ہے۔ مولانا طفیل احمد صاحب نے جو سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگوں اور دارالعلوم دیوبند کے فضلاء میں سے ہیں اور آج کل افادہ و افاضہ میں نمایاں کام کر رہے ہیں، فرمایا کہ حضرت مفتی اعظم قدس سرہٗ کی وفات کے بعد انھیں خواب میں دیکھا کہ حضرت ممدوح ایک نہایت ہی پُر فضا مقام پر ہیں اور نہایت بشاشت اور بہترین حالات و مقامات پر ہیں، حسب عادت اخلاق و شفقت سے ملے، اور تھوڑی دیر کے بعد اٹھے، فرمایا کہ یہ وقت حاضری دربار کا ہے اس وقت ہم کو دیدار کرایا جاتا ہے۔ اس وقت مجھ کو وہاں جانا ہے اور یہ کہہ کر وہاں تشریف لے گئے۔

حضرت مفتی علامہ کی پوری زندگی جیسی پاک صاف جیسی سچی اور اچھی گذری دین متین کی خدمت اور عامۃ المسلمین کی نفع رسانی میں گذری اس کا نتیجہ اور صلہ یقیناً یہی ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں آخرت کے اعلیٰ درجات عطا فرمائے اور اپنی رضا اور خوشنودی کی دولت سے مالامال فرمائے۔ مذکورہ خواب اس کی تائید کرتا ہے اور یقیناً یہ بشارت ہے۔ اچھے حسن خاتمہ کی اور ایمان پر خاتمہ ہو جائے اور حق تعالیٰ عفو و درگذر کا

معاملہ فرما کر آخرت کی کامیابی عطا فرما دیں، تو یہ ایک مومن کی معراج ہے اور اس کا منشائے مقصد بھی ہے. ہم حضرت مفتی علامہ کے حق میں یہ حسن ظن، ظنِ غالب کے درجہ میں قائم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یقیناً اپنی بیکراں عنایتوں سے انھیں نوازا ہے. اَللّٰھُمَّ نَسْئَلُکَ رِضَاکَ وَعَفْوَکَ. آمین.

حضرت مفتی علامہ ۱۲۷۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۴۷ھ مطابق یکم دسمبر ۱۹۲۸ء آپ کا سن وفات ہے. ۱۳۰۹ھ میں آپ دارالعلوم میں تشریف لائے اور تاحین حیات علمی خدمت انجام دیتے رہے. حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ آپ بھی دارالعلوم سے مستعفی ہو گئے تھے. جب حضرت شاہ صاحبؒ علالت کی وجہ سے دیوبند تشریف لائے تو حضرت مفتی صاحب نے ڈابھیل تشریف لے جا کر بخاری شریف ختم کرائی.

وہ فقیہِ عصر، شیخِ وقت، ولیٔ کامل، مومنِ قانت کی ایک تصویر تھے.

دیوبند کے مشہور قبرستان، قبرستان قاسمی میں آپ آسودۂ رحمت ہیں.

ذکرِ انور ــــــ امام العصر

حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری

رحمۃ اللہ علیہ

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان نادرہ روزگار شخصیات میں سے ہیں جو اپنی عبقریت و دراست کی بنا پر بلا شبہ زمانہ میں اپنا ممتاز مقام بنالیتی ہے۔ ایسے افراد قوموں اور ملکوں میں قرنہا قرن کے بعد نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کے فضل و کمال فراست و بصیرت، زہد و اتقاء کی بناء پر ان کی ذات ایک ایسے افق کی سی ہوتی ہے جس کو جتنا قریب سے دیکھا جائے وہ اتنا ہی دور نظر آتا ہے۔ دیو بند کی علمی سرزمین کو جن علمائے ربانی اور زعمائے ملک و قوم کی وجہ سے شہرتِ عامہ نصیب ہوئی، ان میں شاہ صاحبؒ کا ایک ممتاز مقام ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے راسخ علم، علمی تبحر، حیرت انگیز حافظہ، قابلِ رشک اتقاء کو دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ باری تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے آپ کو نوازا تھا۔ اور آپ کے ذریعہ صدیوں پرانی علمی روایات کو زندہ کرنا گویا مشیتِ ایزدی کا منشاء تھا۔ ایسے افراد کی دنیا میں کمی نہیں ہوتی جنھیں علمی امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ ایسے بھی لوگ دنیا میں کچھ کم نہیں ہوتے جو تقویٰ و طہارت میں منفرد ہوتے ہیں۔ ایسے افراد بھی ڈھونڈنے

سے مل جاتے ہیں جو غیر معمولی حافظہ رکھتے ہوں. مگر یہ سب صفات بیک وقت کسی شخصیت میں موجود ہوں یہ یقیناً کم ہوتا ہے. اور ایسے افراد کی فہرست میں حضرت شاہ صاحبؒ کا نام نامی یقیناً نمایاں ہوگا.

حضرت شاہ صاحبؒ کو دیکھنے والی آنکھیں ابھی زندہ ہیں. ان کے بہت سے تلامذہ بقیدِ حیات ہیں. انکی مبارک صحبتوں سے فیض یاب ہونے والے ابھی موجود ہیں. ان سب حضرات کی زبانی حضرت شاہ صاحبؒ کے چشم دید حالات جو کچھ سنے ہیں یا پڑھے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کسی قرنِ اول میں موجود ہونے والے صاحبِ علم و عزیمت شخص کا تذکرہ سن رہے ہیں.

آج کے علمی انحطاط کے دور میں یہ بات فکر و ذہن کے لیۓ جلدی سے قابلِ قبول نہیں ہوتی کہ کوئی شخص بیس یا پچیس برس پہلے پڑھی ہوئی کتاب کا حوالہ اس طرح دیدے جیسے اس کو ابھی دیکھا ہے. مگر حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق یہ حقائق اس طرح محقق ہیں جیسے خود حضرت شاہ صاحبؒ کا وجود.

حضرت شاہ صاحبؒ کشمیری النسل تھے. کشمیر سے حصولِ علم کے لیۓ دیوبند تشریف لائے. یہاں کے اولیاۓ وقت اساتذۂ کرام سے بالعموم اور حضرت شیخ الہندرہ سے بالخصوص علمی استفادہ فرمایا. تا آنکہ یہیں پر تکمیلِ علوم کے بعد چند مختلف مقامات پر قیام فرمانے کا اتفاق ہوا اور آخرکار اپنی مادرِ علمی دارالعلوم میں مسندِ علم کو منور کرنے لگے. اپنے استاذِ مکرم حضرت شیخ الہندرہ کے بعد دارالعلوم کی مسندِ حدیث کو آپنے اس طرح رونق بخشی کہ لوگ حضرت شیخ الہندرہ کے بعد غیر معمولی علمی خلاء کو پُر دیکھ کر مطمئن ہوگئے. خیال تھا کہ دارالعلوم کی مسندِ حدیث کو جو تب و تاب حضرت شیخ الہندرہ کی ذات بابرکات سے حاصل تھی وہ

آئندہ باقی نہ رہ سکے گی۔
دار العلوم کی علمی روایات کا، جو حقیقی بھرم آج تک قائم تھا وہ آئندہ نظر نہ آسکے گا۔ حضرت شیخ الہند جیسی ہمہ گیر شخصیت کا سایہ دار العلوم سے اٹھ جانا واقعی ایک حادثہ تھا۔ جس پر ہر دل خون اور آنکھ بے نور تھی۔ مگر قدرت کی کرم فرمائیوں کے انداز بالکل نرالے ہوتے ہیں۔ ہزیمتوں اور ناکامیوں کے ہجوم سے ایسی ایسی کامرانیوں اور شادمانیوں کے در کھل جاتے ہیں کہ انسان سنبھل جانے کی پوزیشن میں آجاتا ہے۔ کچھ یہی واقعہ حضرت شیخ الہند کے وصال کے بعد پیش آیا کہ لوگ جب یہ سمجھنے لگے کہ اب اس علمی خلاء کو پُر کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے آپ کے جانشین ہونے کی حیثیت سے اس خلاء کو بڑی خوبصورتی سے صرف پُر ہی نہیں کر دیا بلکہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس میں چار چاند لگا دیئے۔
علم و عمل کا ایسا پیکر جمیل کہ جس پر ایک عام آدمی کی نظر پڑے تو بیساختہ اس کا ضمیر کہہ اٹھے کہ یہ کسی معمولی شخصیت کا انسان نہیں۔ وہ جب طلبہ اور علماء کے مجمع میں دادِ علم دیتا تو معلوم ہوتا کہ فرش و عرش تک نورِ عرفاں کی دنیا آباد ہو گئی ہے۔ اللہ اکبر!
حضرت شاہ صاحبؒ کی گوناگوں باکمال شخصیت کئی جہتوں سے قابلِ ذکر ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی، ان کے علمی افادات، انکی امتیازی خصوصیات، ان کی دقّتِ نظر، ان کا علمی تبحر اور ان کا بے مثال حافظہ وغیرہ ان سب عنوانات پر شاہ صاحب کے فاضل تلامذہ نے "حیاتِ انور" میں سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ دراصل یہ حصہ انھیں لوگوں کا ہے بھی کہ خوش قسمتی سے انھوں نے شاہ صاحب کے علمی افادات سے اپنے جیب و دامن کو بھرا ہے۔ انھوں نے ان کے درس میں شاہ صاحبؒ

کے وہ علمی نکات اور فنی دقائق سنے ہیں، جو ان کے بعد عنقا ہو گئے۔ انھوں نے شاہ صاحبؒ کے شب و روز کی زندگی دیکھی ہے جو تورع اور تقویٰ میں ڈھلی ہوئی تھی۔ انھوں نے شاہ صاحب کے حافظہ سے متعلق وہ واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں جو آج افسانہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ تحریر تو عقیدتمند کا وہ اظہارِ عقیدت ہے جو شاہ صاحبؒ سے متعلق دل میں ہمیشہ ایک مقدس داعیہ کی طرح محفوظ رہا ہے۔ بزرگوں کے تذکار سے اپنے حصہ کی سعادت حاصل کر لینا بلاشبہ ایک مبارک مشغلہ ہے۔ یہ معروضات اسی ضمن میں سمجھیے۔

انسان اپنی زندگی میں بہت سی آرزوئیں اپنے دل میں رکھا کرتا ہے۔ کاش میں نے فلاں کو دیکھا ہوتا، کاش میں نے فلاں کو سنا ہوتا، کاش مجھے فلاں کی صحبت میسر آتی، وغیرہ۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے واقعات پڑھ کر اور سن کر بے ساختہ دل نے آرزو بارہا کی ہے کہ کاش ان کی زیارت کا شرف ان گنہگار آنکھوں کو حاصل ہوا ہوتا۔ ایک ایسا باکمال عالم جس کا استاذ بھی اس کا احترام کرتا ہو، اور ازراہِ عزت افزائی بجا طور پر اس کو علامہ کے خطاب سے نوازتا ہو۔ اور علمی اشکالات میں اس کے جواب میں نہ صرف اطمینان بلکہ مسرت کا اظہار کرتا ہو، جس کی شان یہ ہے کہ صرف نو برس کی عمر میں فتاویٰ دینے لگا ہو، جس کا شوقِ علم یہ ہو کہ بچپن ہی میں علوم و فنون کی اونچی کتابوں کو حل کر لیا ہو، جس کے حافظہ کا یہ عالم ہو کہ بیس پچیس سال تک جوں کی توں کتابوں کی عبارتیں محفوظ رہ جاتی ہوں، جس کی عظمتوں کی یہ بات ہو کر وقت کا بڑے سے بڑا صاحب نظر عالم و فاضل آپ کے علم کا لوہا مانتا ہو، جس کا علمی تبحر یہ ہو کر لوگ اس کو چلتا پھرتا کتب خانہ کہتے ہوں، جس کی ظاہری وجاہت اور حسن ظاہری کا یہ رنگ ہو کہ آنکھ دیکھے تو دیکھتی ہی رہ جائے۔ ایسی خصوصیات کے حامل انسان کو بھلا

دیکھنے کی تمنا کون نہیں کرے گا، کس کی یہ خواہش نہ ہوگی کہ کاش ہم نے بھی ان کی صحبتوں کا لطف اٹھایا ہوتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ آیۃٌ من آیات اللہ تھے۔ میں نے یہ واقعہ ایک صاحب کی زبانی سنا کہ ایک سفر میں کسی غیر مسلم نے حضرت شاہ صاحبؒ کو دیکھا تو اس نے بے ساختہ کہا۔ اس شخص کے چہرے پر تو دیوتا کا نور ہے۔ اور یہ کوئی بڑا پہونچا ہوا انسان معلوم ہوتا ہے۔

استغناء کی شان حضرت شاہ صاحبؒ کی کمال درجہ کی تھی۔ ارباب دار العلوم کے اصرار پر جب آپ نے مدرسی اختیار فرمائی تو اس کا کوئی معاوضہ یا تنخواہ اس وقت تک نہیں لی جب تک کہ آپ کی شادی نہیں ہوئی۔ شادی ہو جانے کے بعد چونکہ اخراجات کے لئے ضروری تھا کہ آپ تنخواہ لیں۔ اس لئے ادارے کے اصرار پر آپ نے تنخواہ لینی شروع کر دی۔

اسی طرح ایک صاحب نے واقعہ سنایا جو غالباً اب تک حیطۂ تحریر میں نہ آیا ہو کہ ایک مرتبہ شاہ صاحب سورت کیطرف ایک شادی میں تشریف لیگئے۔ شادی سے فراغت کے بعد واپسی پر میزبان نے جو حضرت شاہ صاحبؒ کے عقیدتمند تھے، ایک خوان آپ کی خدمت میں پیش کیا جس میں قیمتی کپڑے اور کچھ رقم تھی۔ اور عرض کیا کہ یہ حضرت کی "نذر" ہے۔ قبول فرمائیں۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا بھائی "نذر" تو اللہ کی دی ہوئی کافی ہے، میں تو یہ چیز لینے کا عادی نہیں ہوں۔ کافی اصرار کے باوجود حضرت شاہ صاحب نے نہیں لیا۔

دار العلوم کے تعلق کے زمانہ میں نواب ڈھاکہ نے گرانقدر مشاہرہ پر آپ کو اپنے یہاں بلانا چاہا مگر آپ نے انکار کر دیا۔

اسی طرح مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ایک معقول معاوضہ پر آپ کو بلایا گیا، مگر آپ نے گوارہ نہیں کیا۔

اسی طرح ریاست حیدر آباد دکن میں آپ کو ایک بڑے علمی اور دینی منصب کے لیئے بلایا گیا مگر آپ نے معذرت کر دی۔

آپ اپنے تلامذہ سے فرمایا کرتے تھے کہ جو لوگ علمِ دین کو حصولِ دنیا کے لیئے پڑھتے ہیں وہ گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خوبصورت باتیں بنا دینا نہایت آسان ہے مگر ان پر اپنی زندگی کو منطبق کر کے دکھانا یہ ایک صاحبِ عزیمت انسان ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ حضرت شاہ صاحبؒ کی زندگی کا یہ رُخ بھی ایسا ہے کہ آپ کے دیگر اوصاف کے ساتھ مل کر آپ کی شخصیت کو روشن و تابناک بناتا ہے۔ بلکہ کسی مبالغہ کے بغیر یہ کہنا حق بجانب ہو سکتا ہے کہ آپ اوصافِ عالیہ کا ایک حسین مجموعہ تھے۔ حسن سیرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کسی کو حُسنِ صورت سے بھی نواز دیں تو یہ متأثر کرنے میں اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔

شاہ صاحب کے تلامذہ اور مستفدین میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کا بیان ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی مجلس میں بیٹھ کر آپ کے رُخِ زیبا سے نظر نہیں ہٹتی تھی، جی چاہتا تھا کہ آپ کو پہروں دیکھتے رہیں۔

ان سطور کے راقم نے شاہ صاحبؒ کو نہیں دیکھا لیکن یہ شرف اس بے بضاعت کو ضرور حاصل ہوا ہے کہ دورۂ حدیث احقر نے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ کے سامنے پڑھا ہے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ جو اپنی ذات والا صفات کے اعتبار سے بلاشبہ اسلاف کا نمونہ تھے۔ یاد ہے کہ سبق میں حضرت شیخ علیہ الرحمہ درس کی تقریر ... فرماتے تھے اور مجھ جیسے نہ جانے کتنے صرف حضرت شیخ کے چہرۂ انور کو دیکھتے رہتے تھے اور عالم ہوتا تھا کہ نظر ہٹنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کیف و انبساط کا یہ عالم کبھی نہ ختم ہو۔ اپنے

اس ذاتی تجربہ کی بنا پر حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں شروع کی سطروں میں اشارۃً ظاہر کیا گیا ہے کہ آپ تقویٰ اور عبادت گذاری اور خدا ترسی میں بھی بلند مقام رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب کے ایک ہم سبق ساتھی کا صرف یہ واقعہ سنتے چلیے۔ فرماتے تھے :۔

" یہ کشمیری ہم عمر نوجوان رات گئے تک مطالعہ میں مصروف رہا اور نصف شب کے بعد جب نیند کا غلبہ ہوا تو وہی گنڈلی مار کر پڑ گیا اور تھوڑی دیر آنکھ جھپک کر اٹھا اور وضو کر کے نوافل تہجد میں مشغول ہو گیا، نوافل سے فراغت ہوئی تو پھر مطالعہ میں مشغول ہو گیا "

شاہ صاحب کے ان ہم عمر ساتھی کا نام مولانا مشیت اللہ ہے جو ازاول تا آخر حضرت شاہ صاحبؒ کے مخلص جانثار رہے اور جن کے تعلق کا یہ عالم تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ بھی تعطیلات کے زمانہ میں مولانا مشیت اللہ صاحب کے یہاں قیام فرمانا پسند فرماتے تھے۔ یہ واقعہ بطور خاص اس واسطے نقل کیا ہے کہ ہم سبق ساتھی باہم بہت کم عقیدت مند ہوا کرتے ہیں، ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا اور دیگر خوب و زشت احوال سامنے ہوتے ہیں، اس لیے عقیدت پیدا ہونے کا باہمی کوئی امکان نہیں ہوتا۔ ایک بات جو درحقیقت ہزار کرامتوں پر بھاری ہے ایسی سنی اور پڑھی ہے کہ باید و شاید حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ایک مرتبہ فرمایا کہ شاہ صاحبؒ نے ایک روز سبق میں برسبیل تذکرہ بیان کیا کہ " شعور آجانے کے بعد سے آج تک میں نے کسی دینی کتاب کو بغیر وضو ہاتھ نہیں لگایا۔" سبحان اللہ شاہ صاحب کے بارے میں یہ بات تو بہت زیادہ مشہور ہے کہ کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے اگر حاشیہ دیکھنا ہوتا تو کتاب کو ادھر ادھر نہیں کرتے تھے بلکہ خود گھوم جاتے تھے۔ علاوہ ازیں دوران مطالعہ اگر کسی اور طرف متوجہ ہونے کی ضرورت

پیش آگئی تو کتاب کو نہایت ادب کے ساتھ اٹھا کر الماری میں اس کی جگہ رکھتے اور فارغ ہونے کے بعد دوبارہ کتاب کو اٹھاتے اور مطالعہ فرماتے. اگر ایسا اگر متعدد بار بھی کرنا ہوتا تو ادنیٰ تساہل نہ فرماتے. یہ بات عظمتِ علم کے ذیل کی ہے. مگر اس کا تعلق صفائے قلب اور ارتقائے روح سے ہے جو براہِ راست اس بات کی دلیل ہے کہ آپ فطری اور طبعی طور پر ایک طبعِ مزکیٰ اور قلبِ مصفّیٰ رکھتے تھے. اسی کا دوسرا نام تقویٰ اور طہارت ہوتا ہے.

عام طور پر علماء عصری علوم سے ناواقف ہوتے ہیں لیکن شاہ صاحبؒ کی یہ خصوصیت تھی کہ علومِ نبویہ کے علمی اشغال کے ساتھ ساتھ فلسفہ وہیئت حتیٰ کہ رمل و جفر سے بھی واقفیت تامہ رکھتے تھے کہیں کوئی مسئلہ سامنے آیا اور آپ نے برجستہ اس طرح تقریر شروع کر دی گویا اس کے تمام گوشوں پر آپ کی ماہرانہ نظر ہے. ڈاکٹر اقبال جیسا صاحبِ نظر فلسفی اور شاعر اگر کسی سے متأثر ہوا تو وہ شاہ صاحبؒ تھے.

حدوثِ عالم کے موضوع پر شاہ صاحبؒ نے ایک مختصر سا رسالہ تصنیف فرمایا اور اس کی کاپی ڈاکٹر اقبال مرحوم کے پاس بھیجی. ڈاکٹر صاحبؒ نے رسالۂ مذکورہ پڑھا تو دنگ رہ گئے. اور فرمایا حیرت ہے رات دن قال اللہ قال الرسول کرنے والے بوریہ نشین عالم کو یہ مسائل کہاں سے معلوم ہو گئے کہ اس رسالہ میں جو کچھ بیان کر دیا گیا ہے یورپ کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا.

ڈاکٹر اقبالؒ حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں کیسے بلند خیال رکھتے تھے. اور ان کے فرازِ علم و فضل کے کس درجہ معترف تھے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب حضرت شاہ صاحب کا تعلق دارالعلوم سے منقطع ہو گیا اور اس کی اطلاعات اخبارات میں چھپیں تو ڈاکٹر اقبال

نے فرمایا کہ مجھے شاہ صاحب کے استعفیٰ سے ایک گونہ مسرت ہوئی ہے۔ اسلیئے کہ دار العلوم کو صدر مدرس اور بھی مل جائیں گے۔ مگر اسلام کی بعض اہم خدمات کے لیے میں جس درجہ شاہ صاحب کو موزوں سمجھتا ہوں اتنا کوئی دوسرا نہیں ہے۔

ڈاکٹر اقبال کے ذہن میں کام کا ایک نقشہ تھا کہ عصر حاضر کے پیدا کیئے ہوئے جدید مسائل کا صحیح اور اسلامی حل پیش کیا جائے۔ معاشی، سیاسی، تمدنی اور سائنسی دنیا میں نت نئے تغیرات کی بدولت مذہب اسلام کو جو ایک جدید چیلنج کا سامنا ہے، اس کا دفاع کیا جائے جس سے اسلام کی ہمہ گیر صداقت اس کی وسعت پذیر صلاحیت نکھر کر دنیا کے سامنے آجائے۔ ڈاکٹر اقبال کی نظر میں یہ کام سوائے خود ان کے اور حضرت شاہ صاحبؒ کے کوئی دوسرا نہیں کرسکتا تھا۔ اگرچہ یہ کام بروئے کار نہ آسکا، مگر اس سے یہ بات ضرور واضح ہوگئی کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کتنی وقیع رائے رکھتے تھے۔ سچ ہے ولی را ولی می شناسد۔

وقت کا بڑے سے بڑا صاحب علم حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں کیا رائے رکھتا تھا۔ اور ان کو کیا جانتا تھا۔ اس کا نمونہ بھی تھوڑا سا دیکھتے چلیئے۔

علامہ رشید رضا صاحبؒ ہندوستان آئے تو دار العلوم بھی تشریف لائے۔ یہاں ان کے استقبال میں جلسہ ہوا۔ جس میں برجستہ شاہ صاحب نے عربی میں تقریر کی۔ علامہ موصوف شاہ صاحبؒ کی اس بے پناہ طلاقت لسانی سے اتنا متاثر ہوئے کہ رخصت ہوتے ہوئے فرمایا کہ اگر میں اس دار العلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس ہوکر جاتا۔ اس دار العلوم نے مجھ کو بتادیا ہے کہ "ہندوستان میں ابھی علوم

اور تعلیمات مذہبی اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہیں۔"

علامہ موسیٰ جار اللہ روسی، اسلامی دنیا کے مشہور عالم اور دیدہ ور فاضل تھے۔ آپ ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۱ء میں ہندوستان آئے تو دیوبند بھی تشریف لائے اور آپ نے حضرت شاہ صاحبؒ سے مفصل تبادلۂ خیال کیا اور مختلف عنوانات پر علمی گفتگو فرمائی۔ آخر کار انھوں نے حضرت شاہ صاحب کی عظمتِ شان کا اعتراف کیا۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو علماء کی صف میں بلاشبہ ایک منفرد شان کے مالک ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ "اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل حضرت شاہ صاحبؒ کا اسلام بھی ہے۔ اگر مذہب اسلام میں کوئی کجی یا خامی ہوتی تو حضرت شاہ صاحب جیسا نکتہ رس عالم اس کو ہرگز قبول نہ کرتا"

رئیس احرار حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے آپ کے متعلق کہا ہے اور خوب کہا ہے کہ "صحابہ کا قافلہ گذر رہا تھا شاہ صاحب پیچھے رہ گئے۔ شاہ صاحب کے مقام بلند سے متعلق ایسی خوبصورت بات شاہ بخاری نے کہی ہے کہ ایمان تازہ ہوجاتا ہے۔

استاذ العلماء حضرت مولانا محمود الحسن صاحب (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ صاحبؒ کو علامہ کے لقب سے یاد فرماتے تھے اور ہمیشہ علمی مسائل میں آپ کے جواب پر اطمینان کا اظہار فرماتے تھے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب قدس اللہ سرہٗ نے فرمایا کہ میں حجاز، شام و عراق کے علماء و فضلاء سے ملا ہوں۔ لیکن تبحر علمی، جامعیت علوم، قوتِ حافظہ، مہارت علوم عقلیہ و نقلیہ میں شاہ صاحب کا کوئی نظیر نہیں پایا۔

حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے

مجھے جب کوئی علمی اشکال ہوتا تو کتب خانہ دارالعلوم کی طرف رجوع کرتا۔ وہاں ناکامی ہوتی تو حضرت شاہ صاحب سے دریافت کرتا۔ ان کا جواب آخری اور تحقیقی ہوتا۔ اور اگر شاہ صاحب یہ فرما دیتے کہ میں نے کتابوں میں یہ مسئلہ نہیں دیکھا تو مجھے یقین ہو جاتا کہ اب یہ مسئلہ کہیں نہیں ملے گا۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ صاحبؒ کے انتقال پر فرمایا تھا کہ ۔۔۔ مصر و شام کا کوئی آدمی مجھ سے پوچھتا کہ تم نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ و شیخ تقی الدین ابن دقیق العید اور سلطان العلماء حضرت شیخ عز الدین (رحمہم اللہ علیہم) کو دیکھا ہے تو میں استعارہ کر کے کہہ دیتا تھا کہ ہاں میں نے دیکھا ہے۔ کیونکہ صرف زمانہ کا تقدم و تاخر ہے۔ ورنہ اگر حضرت شاہ صاحبؒ بھی چھٹی یا ساتویں صدی میں پیدا ہوتے تو اسی طرح آپ کے محامد و مناقب بھی اوراقِ تاریخ کا گرانقدر سرمایہ ہوتے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ حافظ ابن حجرؒ، شیخ تقی الدین اور سلطان العلماء کا انتقال آج ہو رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اشخاص و افراد کے سلسلہ میں مبالغہ آرائی سے اکثر کام لیا جاتا ہے۔ اور سننے یا پڑھنے والوں کو صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ یہاں حقیقت کم اور تصنع زیادہ ہے۔ مگر حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں جب ہم اربابِ علم و فضل کی آراء پڑھتے ہیں تو دل گواہی دیتا ہے کہ یہ حقیقت سے لگتی ہوئی باتیں ہیں۔ بلکہ تواتر کے ساتھ ان کے حالات پڑھنے کے بعد یہ احساس کبھی کبھی لبِ اذعان ہوتا ہے کہ جیسے الفاظ اپنے معانی کے ساتھ حضرت شاہ صاحبؒ کے علوئے شان کے اظہار سے قاصر رہے ہیں۔ عجزِ بیان کا یہ مرحلہ وہیں آتا ہے جہاں بہت کچھ کہہ چکنے کے بعد دل میں یہ احساس جاگے کہ ابھی تو کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ العظمۃ للہ۔

کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ قدرت نے جب علم و فضل کو مجسم کرنا

چاہا تو اس کا نام انور شاہ تھا۔ دنیا علم و فن، ترقی و ارتقاء کے میدان میں بہت آگے گئی ہے۔ مگر بلا تکلف یہ بات کہنے دیجیے کہ اسلاف جن بلندیوں کو چھو گئے، آج کی دنیا اس کی گرد راہ بھی نہ پا سکی ہے۔

آج کہیں علم ہو تو وسعت کہاں، یہ بھی ہو تو عملِ صالح کہاں، صبر و توکل، قناعت و بے نیازی جیسے اوصاف کہاں؟ تب اس جیسی ہمہ گیر شخصیت جس میں یہ اوصاف بیک وقت تھے کیسے اور کہاں ہو سکتی ہے۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ تنہا علم کوئی چیز نہیں ہوتی اور نہ تنہا عمل کوئی شئی ہوتی ہے۔ تقویٰ بھی بغیر علم صحیح کے خطرہ ہی ہوتا ہے۔ مگر یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ جمع فرما دیں تو پھر اس کی شخصیت کا لوہا سب کو ماننا پڑتا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کو دنیا نے خراج تحسین ادا کیا ہے، مگر یوں ہی نہیں بلکہ جب پرکھ لیا تب۔ دنیا بڑی بے رحم کسوٹی ہے۔ یہ کھرے کھوٹے کو پہچاننے میں کوئی رورعایت نہیں کرتی۔ موقع ہو تو منہ مانگا خراج دیتی ہے ورنہ بے رحمی کے ساتھ نظر انداز کر دیتی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی ایک یہی خصوصیت نہیں کہ خود دیدہ ورعالم تھے بلکہ ایسی پارس کی پتھری تھے کہ جو چھو گیا کندن بن گیا۔ چنانچہ علماء و فضلاء کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے حضرت شاہ صاحب سے استفادہ کیا ان کے سامنے زانوئے ادب طے کیا اور وہ آج علم و کمال کے مہر و ماہ بنے ہوئے ہیں۔ اور بجا طور پر حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ اپنے انتساب پر فخر کرتے ہیں۔ ایک ایسی شخصیت جس نے مطالعہ کتب کو اپنی روح رواں بنالیا تھا۔ جس نے علم کے سانچے میں خود کو ڈھال کر اپنی ذات کو امر بنالیا تھا۔

بزرگوں کا ذکر خیر ہوتے رہنا مفید بھی اور مناسب بھی۔ علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں۔ اللہ کے رسول کے نائب ہوتے ہیں۔ اپنے فضائل و مناقب میں عام مخلوق سے بلند ہوتے ہیں۔ خدا کا خوف ان میں عام لوگوں

سے زیادہ ہوتا ہے۔

انکی صحبتوں میں دل کی کدورتیں صاف ہوتی ہیں۔ ان کو محبت و عقیدت سے دیکھنا بھی ثواب ہے۔ وہ قرآن و حدیث کے مقدس پیغام کو صحیح مطالب کے ساتھ لوگوں تک پہونچاتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کو دوسروں کے لئے نمونہ بنا کر دکھاتے ہیں تاکہ دوسرے بھی راہِ راست پر چل کر امت کے اصحاب خیر لوگوں میں سے ہو جائیں لیکن وہ چونکہ بہرحال انسان ہوتے ہیں اسلئے بشری کمزوریوں سے مبرّا قطعاً نہیں ہوتے ہیں۔

انہیں پیغمبرانہ معصومیت یا ملائکۃ اللہ کی عصمت کا دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کسی بھی بزرگ کے تذکرے میں یہ نکتہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ہمارے مقتدا اور رہنما ہیں، مگر معصوم نہیں۔ یہ سطور صرف اسی لئے لکھی جا رہی ہیں۔

ولادت ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء وفات ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء

مدفن دیوبند قریب عیدگاہ۔

حکیم الامت

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ علیہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے امت کی اصلاح اور اعمال کی درستگی کے لیے بیش بہا کام کیا ہے۔ اس کا احساس پوری امت کو ہے۔ آپ کی تصانیف، آپ کے مواعظ آپ کے ارشادات پوری امت کے لئے روشنی اور ہدایت کا مینارہ ہیں جس سے تاقیامت صلاح و فلاح ہدایت وسعادت کی روشنی پھیلتی رہے گی اور کرنے والے اس سے رہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔ حضرت تھانوی رح کو حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ، حضرت شیخ الہند رح، مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ وغیرہم جیسے اولیائے کبار کی زیارت اور ان سے کسب فیض کا موقعہ ملا تھا۔ ان مبارک نسبتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم وفضل، تقویٰ وطہارت، حسن معاملت اور افادہ کی بیش بہا دولت سے نوازا تھا۔ ظاہر و باطن کی خرابیوں اور خامیوں کی اصلاح آپ جس طریقے اور جس تدبیر سے فرماتے تھے وہ آپ کا اپنا خاص امتیاز

تھا، اس امتیاز میں آپ منفرد تھے۔ آپ کی نظر کی گہرائی اور فکر و فہم کی گیرائی ایسی بے مثل تھی کہ کسی معاملہ میں چھوٹی سی چھوٹی جزئی بھی آپکی گرفت سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ تصنع و تکلف، ریاکاری اور چرب زبانی سے کوئی شخص آپ کو مغالطہ دے جائے ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ اگر کوئی شخص ایسی غلطی کر جاتا تو فوراً پکڑا جاتا تھا۔ آپ کی ذات اور آپ کی خانقاہ در اصل بیمار ذہنوں اور علیل قلوب کا شفا خانہ تھا۔ جہاں جو شخص پہونچ جاتا وہ اپنے وقت کے مسیحا کے ہاتھوں شفا پا کر ہی نکلتا تھا۔ اللہ ہی جانتا ہے کتنے بھٹکے ہوؤں کو آپکے ذریعہ راہِ ہدایت ملی۔ کتنے بگڑے ذہنوں اور فساد آلود دلوں کو آپ سے ہدایت اور اصلاحِ اعمال کی توفیق میسر آئی۔ آج بھی آپ کی باقیات الصالحات ہدایت و رہنمائی کا کام کر رہی ہیں، جماعتیں اور تنظیمیں ملکر جتنا کام کریں حضرت تھانوی رح کی تنہا ذات نے اپنا کام کیا جو آج بھی زندہ ہے۔ اور ہزاروں کو نیکی اور خیر کی زندگی بخش رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کھلی آنکھوں سے دکھلا دیتے ہیں کہ جب وہ کسی سے کوئی عظیم الشان کام لینا چاہتے ہیں تو اس کے لیے اس کے جملہ اوقات میں کیسی برکت عطا فرما دیتے ہیں۔

حضرت تھانوی کے احوال دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی حیات کا ایک ایک لمحہ نہایت قیمتی مصرف میں صَرف ہوتا منظم اور مرتب نظامِ اوقات کے تحت آپ اپنے کام انجام دیتے تھے۔ اور اس کی رعایت کرنے کی ہدایت دوسروں کو بھی فرماتے تھے۔ اسی مرتب اور منظم زندگی کی وجہ سے آپسے ملت کی اصلاح کا اتنا عظیم الشان کام سرانجام پا سکا۔ تصنیف و تالیف کا کام ہو، خطوط کے جوابات دینے کا کام ہو، مجلس کی حاضری ہو، آنیوالوں سے ملاقات کا کام ہو، اپنے گھر کے کاموں کی ذمہ داری ہو، اسفار ہوں، وعظ و تقریر کا سلسلہ ہو۔ یہ تمام امور اپنے اپنے

متعینہ اوقات پر انجام پاتے تھے، آپ کے مواعظ جن کی تعداد پانچ سو کے قریب بتائی جاتی ہے اور آپ کی تصانیف کی تعداد جو ایک ہزار کے قریب بیان کی جاتی ہے انہی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ تنہا ایک آدمی نے اکیڈمیوں کے برابر کام کیسے کر دیا۔ کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے نیک بندوں کے اوقات میں برکت عطا فرماتا ہے تو تھوڑے وقت میں زیادہ کام ہوتا ہے اور یہ بھی کرامت سے کم نہیں۔

حضرت حکیم الامت کی ولادت ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ چہار شنبہ کو ہوئی۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام عبدالحق تھا جو میرٹھ میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ فارسی زبان کے ماہر بڑے ذہین اور صاحب فراست تھے۔ چنانچہ اپنے دونوں لڑکوں اشرف علی اور اکبر علی کو ان کی افتاد طبع اور ذوق کا اندازہ کر کے بڑے صاحبزادہ کو عربی دینیات کی تعلیم میں لگایا، اور چھوٹے صاحبزادے اکبر علی کو انگریزی اور علوم دنیوی میں لگایا۔ ایک مرتبہ مرحوم کی بھاوج نے جب کہا کہ بھائی تم نے چھوٹے کو انگریزی پڑھائی ہے وہ تو خیر کما کھائے گا۔ بڑا عربی پڑھ رہا ہے وہ کہاں سے کھائے گا۔ اس کا گذارا کس طرح ہوگا۔ اس پر مرحوم کو جوش آیا اور فرمانے لگے بھابھی صاحبہ تم کہتی ہو کہ عربی پڑھ کر کھائے گا کہاں سے خدا کی قسم جس کو تم کھانے والا سمجھتی ہو اس جیسے اس کی جوتیوں سے لگے لگے پھریں گے اور یہ ان کی جانب رخ بھی نہ کرے گا۔ والد بزرگوار کی یہ پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی جو آپ کی فراست کا ثبوت تھا۔ بچپن ہی سے حضرت کو کھیل کود یا ناپسندیدہ اشغال سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ شروع ہی سے طبیعت میں نیکی دینداری کا رجحان پایا جاتا تھا۔ کھیلوں میں نماز باجماعت کی نقل کرتے تھے۔ کبھی بازار میں جاتے اور مسجد پر نظر پڑ جاتی تو سیدھے

ممبر پر چڑھ کر خطبے کی طرح کچھ پڑھ کر لوٹ آتے۔ ۱۲-۱۳ برس کی عمر ہی میں شب بیداری کا چسکہ لگا۔ پچھلی رات میں اٹھتے اور تہجد میں مشغول ہو جاتے۔ آپ کی نانی صاحبہ کم عمری میں اس مشقت آمیز عمل سے کڑھتیں اور منع کرتیں۔ مگر یہ دل کی لگی کہاں کم ہوتی تھی۔ چنانچہ انہی علامات اور آثار کو دیکھ کر مولانا شیخ محمد صاحب جو حضرت میاں جی نور محمد صاحبؒ کے خلیفہ خاص تھے۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ میرے بعد یہ لڑکا میری جگہ ہوگا۔ شروع ہی سے ایسے اشارات ملنے لگے تھے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو معرفت و حقانیت کی دولت بے بہا عطا فرمانے والے ہیں۔ چنانچہ بچپن ہی میں حضرت نے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ ایک بڑے مکان میں ایک پنجرہ رکھا ہوا ہے جس میں دو خوبصورت کبوتر ہیں۔ کچھ دیر بعد شام ہوئی اور تاریکی چھا گئی۔ ان کبوتروں نے حضرت سے کہا ہمارے پنجرہ میں روشنی کر دو۔ حضرت نے کہا خود ہی کر لو۔ چنانچہ انھوں نے اپنی چونچیں رگڑیں اور ساتھ ہی ایک تیز روشنی ہوئی، جس سے سارا پنجرہ روشن ہو گیا۔ آپ کے ماموں واجد علی صاحب نے اس کی یہ تعبیر دی تھی، دو کبوتر کی روح و نفس تھے۔ انھوں نے تم سے درخواست کی تم مجاہدہ کرکے انھیں نورانی کر دو۔ مگر تم نے جو یہ کہا کہ تم خود ہی روشنی کر لو اور انھوں نے اپنی چونچ رگڑ کر روشنی کر لی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انشاءاللہ بلا ریاضت ہی حق تعالیٰ تمہاری روح اور نفس کو منور کر دیں گے۔ چنانچہ یہ تعبیر درست نکلی اور حق تعالیٰ نے ہدایت و معرفت کی جو قیمتی دولت عطا فرمائی اس سے صرف آپ نے نہیں بلکہ ایک عالم نے فیض حاصل کیا۔

حضرت والا کی ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہوئی۔ حافظ حسین احمد دہلوی سے کلام پاک پڑھا۔ مولانا فتح محمد صاحبؒ اور اپنے ماموں

داجد علی صاحب سے فارسی اور عربی کی ابتدائی اور متوسط کتابیں پڑھیں
پھر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو کر اپنی تعلیم مکمل فرمائی. ۱۳۰۱ھ میں
جبکہ آپ کی عمر ۱۹، ۲۰ برس کے لگ بھگ تھی آپ نے فراغت حاصل
کی۔ دیوبند میں مولانا منفعت علی صاحبؒ، مولانا یعقوب صاحبؒ اور
مولانا محمود الحسن صاحبؒ وغیرہم سے آپ نے کتابیں پڑھیں۔ پورا
دور طالب علمی کا پوری سادگی نیکی اور یکسوئی کے ساتھ گذارا۔ تکلف
اور تصنع اور تضییع اوقات سے مکمل پرہیز فرماتے تھے۔ اگر کبھی وقت
فارغ ہوتا تو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی خدمت میں حاضر
ہو جاتے اور حضرت کی زیارت اور ارشادات سے مستفید ہوتے۔
فراغت کے بعد اپنے بزرگوں کے حکم اور والد ماجد کی اجازت سے
کانپور تشریف لے گئے جہاں صدر مدرسی کے منصب پر فائز رہ کر طلبہ اور
عوام کو خوب خوب فیضیاب کیا۔ ۱۴ برس کانپور میں قیام کے دوران
درس و تدریس، تصنیف و تالیف، وعظ و تقریر اور افتاء وغیرہ
کے ذریعہ عامۃ المسلمین کی خدمت کی جس سے لوگ گرویدہ ہو گئے اور
حضرت کا وجود ان کو ایک نعمت غیر مترقبہ محسوس ہونے لگا کہ ایسا مخلص
اور جامع الکمالات صاحب علم و فضل عالم کب میسر آتا ہے۔ آپکی
صلاحیت و استعداد کو دیکھ کر سب کے دلوں میں آپ کا احترام اور
قدر و منزلت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ جب آپ نے کانپور کا قیام ترک
کیا تو وہاں کے لوگوں نے اس کو اپنے لیے بہت بڑا نقصان سمجھتے
ہوئے ہر قیمت پر آپ کو روکنے کی کوشش کی مگر آپ ۱۳۱۵ھ میں
تھانہ بھون تشریف لے آئے۔ یہاں تشریف لے آنے پر حضرت
حاجی امداد اللہ صاحب نے والا نامہ تحریر فرمایا اور اس میں لکھا کہ
بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ امید ہے کہ خلائق کثیر کو

آپ سے فائدہ ظاہری و باطنی ہو گا۔ اور آپ ہمارے مدرسہ و مسجد کو از سرِ نو آباد کریں۔ میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں۔ یہاں خانقاہِ امدادیہ میں بیٹھ کر جس کو، دکانِ معرفت کہا جاتا تھا۔ آپ نے خلقِ خدا کی رہنمائی اور رہبری کا جو کام کیا وہ پورے عالم پر آشکارا ہے۔ سنہ ۱۳۱۰ھ میں اپنے والد ماجد کی معیت میں جب حرمین شریفین کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے تو ذوق و شوق کا ایک عجیب عالم تھا۔ عشقِ حقیقی کی جو چنگاری دل میں بھڑک چکی تھی وہ شعلہ بن رہی تھی۔ ایسے مرحلے میں ضرورت تھی ایک رہبرِ کامل کی۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ حاجی صاحب نے اس سے پہلے ہی آپ کے والد کو کہلا بھیجا تھا کہ تم حج کو آؤ اور جب آؤ تو اپنے بڑے لڑکے کو لیتے آؤ۔ غرض یہ ہے کہ حاجی صاحبؒ نے بیعت کر لیا اور ظاہری و باطنی فیوض سے نوازا۔ سالک کو اس راستے میں جیسے جیسے جانگداز مرحلوں کا سامنا ہوتا ہے وہ بھی آئے مگر شیخ کامل نے ہر موقع پر رہبری کی اور تمام گھاٹیوں کو عبور کرا دیا۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے مکہ معظمہ ہی میں جب حضرت تھانویؒ رخصت ہونے لگے تو یہ نصیحت فرمائی تھی "دیکھو میاں اشرف ہندوستان پہونچ کر تم کو ایک حالت پیش آئے گی عجلت مت کرنا"۔ چنانچہ یہ کیفیت آئی کہ ہر چیز سے آپ کا دل اچاٹ ہو گیا۔ ایک عجیب اضطراب و اضطرار کی حالت پیدا ہو گئی وعظ و تقریر، درس و تدریس سب سے دل پھر گیا۔ غلبۂ حال سے بے حال ہو گئے۔ سوزِ عشق نے بے قراری و بے چینی کی صورت پیدا کر دی۔ اس کیفیتِ طبع کی اطلاع ایک جانے والے کے ہمراہ قطب العالم حضرت حاجی صاحبؒ کو ایک عریضہ کے ذریعہ دی۔ یہ عریضہ جب حضرت کے پاس پہنچا تو حضرت حاجی صاحبؒ کبھی گھر کے اندر تشریف لیجاتے

اور کبھی باہر تشریف لاتے اور بار بار فرماتے کہ جوان آدمی ہیں غلبہ ہو گیا ہے تحمل نہیں ہو سکا مگر میں تو اتنی دور ہوں کیا کروں . جو صاحب عریضہ لے کر گئے تھے انھوں نے کہا حضرت میں جلد ہی جانے والا ہوں . حضرت مسرور ہوئے . اور جواب عریضہ ان کے حوالہ کیا . ہندوستان پہنچنے پر جب یہ والا نامہ حضرت تھانوی کو ملا تو اس کا حال حضرت خود بھی بیان فرماتے ہیں کہ قبل ظہر انھوں نے مجھے حضرت کا یہ پیغام سنایا - بس سننے ہی ایسا معلوم ہوا کہ جیسے دیکھتے ہوئے تنور پر کسی نے بھری ہوئی مشک چھوڑ دی ہو اور جلتے ہوئے سینہ پر برف کا ٹکڑا رکھدیا ہو . شوق کی کیفیت انبساط میں بدل گئی . یہ شیخ کامل کا تصرف باطنی تھا جس نے اس موقع پر اپنے مرید و معتقد کی یاوری کی طریقت و معرفت کی راہیں طے ہوتی رہیں .

تا آنکہ ۱۳۱۵ھ میں تھانہ بھون میں مستقل قیام فرما کر مسند ارشاد پر فائز ہو گئے . اصلاح و ہدایت کا جو کام آئندہ اللہ تعالیٰ کو آپ سے لینا تھا ، اس کے واضح اشارات سامنے تھے اور اہلِ نظر اس کو خوب محسوس کر رہے تھے . بزرگانِ وقت جیسے حضرت حاجی عابد صاحبؒ ، حضرت گنگوہیؒ ، حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ ، حضرت شیخ الہندؒ وغیرہم آپ کے جواہر ذاتی اور کمالات باطنی کو دیکھ رہے تھے اور مستقبل میں آپ کے روشن کارناموں کا اندازہ لگا رہے تھے . ایک صاحب مولانا انوار الحسن صاحب کاکوروی نام کے حج کو تشریف لے گئے ، مدینہ طیبہ میں حضرت حکیم الامتؒ سے متعلق انھوں نے ایک خواب دیکھا ان کا کہنا تھا کہ مجھے اس وقت تک حضرت سے کوئی خاص عقیدت نہیں تھی صرف ایک اچھے عالم کی حیثیت سے جانتا تھا ، انھوں نے دیکھا ایک چارپائی پر حضور پُر نور صلے اللہ علیہ وسلم لیٹے ہوئے ہیں اور علیل ہیں اور حضرت تھانویؒ تیمارداری فرما رہے ہیں . اور ایک بزرگ دور بیٹھے ہیں جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ طبیب ہیں . یہ کہتے

ہیں کہ آنکھ کھلنے پر میرے ذہن میں یہ تعبیر آئی کہ حضور تو گیا بیمار ہوتے آپ کی امت بیمار ہے اور حضرت مولانا اس کی تیمارداری یعنی اصلاح فرما رہے ہیں۔ لیکن دوسرے بیٹھے ہوئے بزرگ سمجھ میں نہیں آئے کہ یہ کون ہیں انھوں نے یہ خواب اور اپنی تعبیر لکھ کر حضرت تھانوی کی خدمت میں روانہ کی اور یہ بھی سمجھنا چاہا کہ وہ بیٹھے ہوئے بزرگ کون ہیں؟ حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا کہ وہ حضرت امام مہدی علیہ السّلام ہیں اور وہ چونکہ زماناً بعید ہیں اس لئے مکاناً بعید دکھائی دیے۔ چنانچہ حضرت نے اس مسندِ ہدایت پر بیٹھ کر تمام متاعِ دنیا اور آسائش ظاہرہ کو چھوڑ کر خلقِ خدا کی بے مثال رہنمائی اور ان کی اصلاح کا بے نظیر کام انجام دیا۔

آپ کے اخلاص فی اللہ کی ایک نمایاں دلیل یہ تھی اور جس کی دنیا شاہد ہے کہ آپ کی گرانقدر تصانیف پوری امت کے استفادہ کے لیے عام ہیں۔ اگر ان کتابوں کی رجسٹری آپ اپنے نام کرا لیتے تو بلا مبالغہ چالیس پچاس لاکھ روپے چھوڑ کر جاتے۔ یوں تو آپ کی ہر کتاب نہایت نافع اور گراں قدر ہے مگر بعض کتابیں تو ایسی ہیں کہ وہ اپنی علمی رفعت اور مقبولیت کی بناء پر اپنی نظیر خود ہیں آپ کی بیان القرآن اور بہشتی زیور شاید لاکھوں کی تعداد میں طبع ہو چکی ہوں۔ لاکھوں لوگوں نے ان سے دینی اور علمی فائدہ اٹھایا ہے اور ہمیشہ اٹھاتے رہیں گے۔ حضرت اگر چاہتے تو اپنے لئے یا اپنے متعلقین کے لیے لاکھوں روپیہ اس کے ذریعہ پیدا کر سکتے تھے لیکن آپ کی جانب سے ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ جو چاہے ان کو شائع کر سکتا ہے۔ چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ آج حضرت کے وصال کو ایک عرصہ ہو رہا ہے لیکن آپ کا فیض آپ کا علمی سلسلۂ خیر آج بھی جوں کا توں قائم و ثابت ہے۔ آپکے

اخلاص کی دلیل ہے۔ جو آج کے مدعیانِ اخلاص کے لیے آئینہ نصیحت بن سکتا ہے۔ حضرت کے یہاں اصول پسندی، ضبط ونظم کا خاص اہتمام تھا۔ آپ کی خارجی زندگی ہو یا داخلی زندگی، سب جگہ ضبط ونظم اصول ضوابط کی پوری پابندی ہوتی تھی۔ عام لوگوں کی طبائع چونکہ آزادی پسندی ہوتی ہیں۔ اس لئے بعض طبائع پر یہ قیودات گراں بھی گذرتی تھیں۔ اور بعض معترض ہوتے تھے مگر نتیجہ کے اعتبار سے اور فی الحقیقت جو فائدہ اور مفید کام ضبط ونظم کے ساتھ خوبی کے ساتھ ہو جاتا ہے وہ بغیر اس کے ممکن نہیں ہوپاتا اور مثال خود حضرت تھانوی کی موجود ہے۔ حق تعالیٰ نے ایسا دینی کام حضرت سے کرایا جسکی نظیر صدیوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اور یہ بظاہر کرشمہ تھا۔ آپکی منظم اور مرتب اور اصول پسند طبع سلیم کا جن لوگوں کو آپکی یہ اصول پسندی اچھی نہیں لگتی تھی وہ بھی انجام کار آپ کے طریق کار کے قائل ہوتے تھے کوئی مہمان ہو کوئی طالب حق ہو کوئی اور حاجتمند ہو کسی کو تکلیف نہ ہو اس کے لئے آپنے نقشہ اوقات اعلان ہدایت آویزاں کرایا ہوا تھا، جس میں تمام ضروری ہدایات اور جملہ کاموں کے اوقات کا تعین تھا تمام لوگ مستفدین ہوں یا زائرین سہولت کے ساتھ اپنا اپنا مقصد حاصل کرلیتے تھے۔ اور اسی ضبط اوقات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپسے اتنا عظیم الشان کام کرایا جس پر حیرت وتعجب ہوتا ہے۔ آپ کے یہاں ہر چیز اپنی حد پر ہوتی تھی نہ افراط تھی نہ تفریط، اعتدال وتوازن آپکی خصوصیت تھی جسکی قدر ہر سلیم الطبع انسان کرتا ہے۔ بعض لوگ آپکی تیز مزاجی کی شکایت کرتے مگر ایسا کہنے والے لوگوں کی بیہودہ حرکات اور نامناسب اعمال کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ بیہودگی اور نالائقی کا علاج سوائے اس کے نہیں کہ سختی سے انکا محاسبہ کیا جائے یہی ان کے زہر کا تریاق ہے حضرت کے یہاں اس پر سختی سے عمل تھا۔

چاہے کسی کو اچھا لگے یا بُرا لگے۔ ہر شخص سے اس کی حیثیت کے مطابق معاملہ فرماتے تھے۔ بیکار بحث ومباحثہ اور حیل حجت وغیرہ کو قطعاً روا نہ رکھتے تھے۔ بعض لوگ مسائل وغیرہ کی دلیلیں آپ سے دریافت کرتے اور اتنی اہلیت نہ ہوتی کہ بات سمجھ سکیں ایسے لوگوں کو بڑے منطقی انداز میں لاجواب فرما دیتے تھے۔ ایک مرتبہ سہارنپور میں ایک صاحب بہشتی زیور بغل میں دبائے ہوئے آئے اور حضرت سے فرمانے لگے کہ فلاں مسئلہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ نے فرمایا مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا یا اس کی دلیل سمجھ میں نہیں آئی۔ کہنے لگے دلیل نہیں سمجھا۔ آپ نے فرمایا بہشتی زیور میں جو اور مسائل ہیں وہ مع دلائل سمجھ میں آ گئے۔ اگر سمجھ میں آ گئے تو مجھے کچھ سوالات کرنے کی اجازت دیجیے۔ اور اگر سمجھ میں نہیں آئے تو اسی کو سمجھنے کی کوشش کیوں؟ اس کو بھی انھیں کی فہرست میں شامل کر لیجیے یا اس کی وجہ تخصیص بتائیے۔ بس یہ جواب سُن کر وہ صاحب لاجواب ہو گئے اور اپنا سا منہ لے کر واپس ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ سہارنپور کے علماء کو تین دن سے پریشان کر رکھا تھا وہ بیچارے اس کے سامنے تقریریں کرتے اور یہ حجتیں تراشتا لیکن حضرت کے یہاں اس کا علاج ہو گیا اور شاید سبق بھی مل گیا ہوگا۔ مقصد یہ ہے کہ حضرت کے یہاں وقت کی بہت قدر تھی۔ کوڑ مغزوں کے ساتھ بیکار گفتگو میں وقت ضائع کرنا بالکل پسند نہ فرماتے، اگر کوئی ایسی حماقت کرتا تو حضرت کی گرفت سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔ جس شخص کے نزدیک وقت کی قدر ہو گی وہ غیر ضروری باتوں سے یقیناً احتراز کرے گا۔ اگر کوئی شخص تعویذ لینے آیا اور یہ نہ کہا کہ کس مقصد کے لئے تعویذ درکار ہے تو آپ تنبیہ فرماتے اور تعویذ بھی نہ دیتے۔ فرماتے کہ کبھی ریلوے ٹکٹ لیتے ہوئے بھی یوں کہتے ہو کہ ہمیں ٹکٹ دیدو، وہاں تو پوری بات کہتے ہو کہ فلاں جگہ کا ٹکٹ دیدو اور یہاں پوری بات نہیں کہتے مولویوں کو

فالتو سمجھ رکھا ہے وہ تعویذ بھی دیں اور پوری بات بھی خود ہی پوچھ لو آپ پوری بات بھی بتلانے کی تکلیف نہ کریں۔ فرماتے کہ یہ بے فکری اور دین کی ناقدری کی علامت ہے۔ یہ بات بظاہر معمولی ہے لیکن اصلاحِ باطن اور اصلاح اعمال کے نقطۂ نظر سے اسکی اہمیت بہت زیادہ ہے اور اس کی نزاکت کو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اصلاح کی قدر و قیمت اس کی عظمت اور خوبی کو جانتے پہچانتے ہیں۔ حضرت والا کو اللہ تعالیٰ نے اس منصب پر فائز فرمایا تھا۔ اس لیے آپ کے یہاں ایسی باتوں پر نکیر بھی ہوتی اور گرفت بھی ہوتی۔ حضرت کے یہاں محاسبہ و مواخذہ ہونا بظاہر وہ گراں بھی محسوس ہوتا۔ لیکن جو اس کو برداشت کر جاتا اور اس کی خوبی اور خیر سمجھ جاتا وہ حضرت کا شیدائی اور خانقاہ کا فدائی بن جاتا اور پھر حضرت حکیم الامت کے دربار گہر بار سے وہ سب کچھ پاتا جو ایک طالبِ حق کسی بھی باکمال صاحبِ باطن بزرگ کے آستانے سے پا سکتا ہے۔

آپ کا وصال جولائی ۱۹۴۳ء میں ہوا۔ تھانہ بھون ہی میں آپ آسودۂ رحمت ہیں۔ آپ کے وصال سے گو آپ کا وجود ظاہری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا مگر آپ کا علمی فیض قیمتی تصانیف کی شکل میں بحمد اللہ چونکہ موجود ہے اس لیے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ آپ کی حیات معنوی باقی ہے جو انشاء اللہ تادیر اہلِ دین کے لیے مشعلِ راہ رہے گی۔

رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً

ایک برگزیدہ شخصیت کا، عارف باللہ

حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب

قدس سرہٗ

بر مقامیکہ نقوشِ کف پائے تو بود
سالہا سجدہ گہ اہلِ نظر خواہد بود

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً۔ اما بعد، مولوی سید اصغر حسین ولد سید محمد حسن صاحب مرحوم۔ ساکن دیوبند ضلع سہارن پور۔ اس مدرسہ اسلامیہ عربیہ دیوبند میں ابتدائے ۱۳۱۰ھ میں داخل ہوئے اور ۱۳۲۰ھ تک نہایت محنت اور شوق سے تحصیلِ علوم میں مشغول رہے۔ اس مدت میں مدرسہ ہٰذا کے سلسلہ نصاب کی تمام کتب درسیہ من اولہٖ الیٰ آخرہ اچھی طرح پڑھیں اور مدرسہ کے مدرسین اور منتظمین کی ہمیشہ ان پر نظرِ شفقت رہی۔ اور سب ان سے خوش رہے۔ یہ چند کلمات بطور سند کے تحریر کیے جاتے ہیں اور ان کیلئے توفیقِ خیر کی دعا کی جاتی ہے۔

العبد محمود حسن

العبد احمد۔ مہتمم مدرسہ عربیہ
یکم ربیع الاول ۱۳۲۰ھ

یہ وہ خصوصی تحریر ہے جو حضرت میاں صاحب قدس اللہ سرہ کے دارالعلوم سے فارغ ہونے پر اکابر کی طرف سے ان کو عطا کی گئی، یہ تحریر اس سند کے علاوہ ہے جو ہر فاضل کو عمومی طور پر دی جاتی ہے۔ کون جانتا تھا کہ اپنے بزرگوں اور اساتذہ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اپنے اکابرین کا منظورِ نظر یہ سیدھا سا طالب علم آگے چل کر کیا کچھ بن جائے گا۔

سچ ہے جوہر قابل ہو اور پھر اس پر کوئی مربی کامل میسر آجائے تو انسان کے کندن بن جانے میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی۔

آپ کے والد کا نام سید محمد حسن تھا۔ آپ ۱۲۹۴ھ میں جلوہ فرمائے عالم ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد کے حقیقی ماموں حضرت سید محمد عبداللہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، عرف میاں جی منے شاہ صاحب سے حاصل کی جو اپنے وقت کے مرشد کامل، روشن ضمیر، صاحبِ دل مادرزاد ولی تھے جن کے بارے میں یہ بات بالکل مبالغہ سے خالی سمجھنی چاہیئے کہ وہ ایسے درویش کامل اور مومن صادق تھے کہ جن کے دل میں کبھی گناہ کا تصور بھی نہ گذرا ہوگا۔ ایسے شخص کے سامنے جس نے زانوئے تلمذ طے کیا ہو اس کی سعادت و نجابت کا کیا ٹھکانا۔ چنانچہ حضرت میاں صاحب پر اس ابتدائی تعلیم و تربیت کا جو اثر مرتب ہوا وہ یہ تھا کہ شروع ہی سے آپ کی ذاتی و طبعی شرافت و سعادت نکھرتی چلی گئی۔ اس کے بعد کچھ فارسی اپنے والد صاحب سے پڑھ کر دارالعلوم کے فارسی خانہ میں فارسی کی تکمیل فرمائی۔ اس کے بعد درجہ عربی میں داخل ہو کر جملہ علوم و فنون کی تکمیل اپنے شفیق اساتذہ کی زیرِ تربیت فرماتے ہوئے اپنی سعادت و شرافت کا گہرا اثر اپنے بزرگوں اور اساتذہ کے دلوں پر قائم فرمالیا۔ بزرگوں اور اساتذہ کو آپ سے کس درجہ تعلق تھا، اس کا اندازہ اس سے

ہوسکتا ہے کہ جب ۱۳۱۲ھ میں آپ کے والد بزرگوار کا انتقال ہوا تو آپ کم عمری کی وجہ سے اور بظاہر اسباب بے سہارا ہو جانے کی وجہ سے اس حادثۂ فاجعہ سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، اس موقعہ پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہٗ نے حضرت الحاج مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دار العلوم و حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب نائب مہتمم و حضرت مفتی اعظم حضرت الحاج مولانا عزیز الرحمن صاحب رحمہ اللہ علیہم کی موجودگی میں فرمایا "صاحبزادے والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے پڑھنا مت چھوڑ دینا، تحصیلِ علم میں مشغول رہنا"

جس پر دوسرے موجود بزرگوں نے فرمایا:-

"بھائی ہم بھی تو تمہارے والد اور مربّی ہیں، تم کسی قسم کا فکر و اندیشہ مت کرنا اور اپنی تعلیم میں لگے رہنا"

جواب میں آپ نے فرمایا "بہت اچھا"

اس واقعہ کے وقت آپ کی عمر سترہ برس تھی، اس کے بعد آپ پورے انہماک کے ساتھ اپنی تعلیم میں مشغول ہو گئے یہاں تک کہ ۱۳۲۰ھ میں آپنے تعلیم سے فراغت حاصل کرلی۔ دورانِ تعلیم حضرت شیخ الہند جیسے شیخِ وقت شفیق استاذ کی خصوصی نظر آپ پر پڑی۔ چنانچہ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ دورانِ درس حضرت شیخ الہند کی تقریر آپ کاپی میں ضبط فرمالیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی طالب علم نے آپ کی وہ لکھی ہوئی کاپی چرالی جس کا آپ کو بہت زیادہ صدمہ ہوا۔ اور اسی صدمہ میں آپ سبق میں بھی حاضر نہ ہوئے۔ حضرت شیخ الہند رہ کو اس کی خبر ہوئی تو مکان پر تشریف لائے پورا واقعہ معلوم فرمایا اور تسلّی دی۔ دریافت فرمایا کیا تمہاری ہی لکھی ہوئی تھی۔ آپ نے عرض کیا "جی حضرت میں نے ہی لکھی تھی۔" حضرت نے فرمایا

"پھر کیا غم ہے، پھر لکھ لینا اور عجیب نہیں کہ مل جائے"۔
اس کے بعد اگلے روز آپنے بخاری شریف کے سبق میں تمام طلبہ کو مخاطب فرماتے ہوئے نہایت برہمی اور جوش سے فرمایا کہ، "دیکھو ہمارے سید کی تقریر جس نے لی ہو دے دو ان کو بہت رنج ہے۔ اگر نہیں دے گا تو چاہے ہفت اقلیم کا بادشاہ ہوجائے، لیکن علم سے محروم رہے گا اور خیال نہ کرنا کہ معلوم نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بتلا بھی دیتے ہیں"۔
حضرت شیخ الہند جیسی شخصیت اور برہمی کا یہ انداز تمام طلبہ سناٹے میں آگئے۔ اور پھر نتیجہ یہ ہوا کہ دو چار روز کے اندر وہ کاپی مل گئی۔
تکمیلِ علوم کے بعد حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا الحاج الحافظ محمد احمد صاحب مہتمم مدرسہ قدس سرہٗ نے شہر جونپور کی مسجد اٹالہ کے مدرسہ میں صدر مدرسی کے منصب پر تقرر فرما کر اپنی مخلصانہ دعاؤں کی چھاؤں میں روانہ فرما دیا۔ آپنے وہاں نہایت اخلاص اور مستعدی کے ساتھ سات سال تک علمی اور دینی خدمات انجام دیں۔ تعطیلات کے زمانہ میں آپ دیوبند آتے تو اپنے استاذ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو کر استفادہ فرماتے۔ جونپور کے زمانۂ قیام میں آپ کی ذات بابرکات سے مخلوقِ خدا کو بہت زیادہ فائدہ پہنچا۔ اس لیے وہاں کے رہنے والے آپ کے بہت زیادہ گرویدہ ہوگئے۔ پھر سات سال وہاں رہنے کے بعد آپ کے بزرگوں اور اساتذہ کی رائے ہوئی کہ آپ کو دارالعلوم میں رسالہ القاسم کے اجرار کیلئے بلا لیا جائے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمہم اللہ علیہم کی ایک مجموعی

تحریر آپکے پاس پہونچی۔ جس میں دارالعلوم آجانے کیلئے خواہش کی گئی تھی۔ آپ نے اس سلسلہ میں اپنے شفیق استاذ حضرت شیخ الہند رح سے استفسار فرمایا کہ اگر حکم ہے تو بسر و چشم منظور ہے۔ اور اگر تخییر ہے تو مجھے یہاں نہایت آزادی کے ساتھ خدمت کا موقعہ مل رہا ہے۔

اس استفسار کے جواب میں حضرت شیخ الہند رح نے آپ کو جو خط لکھا وہ ملاحظہ فرمائیے۔ اور اندازہ لگائیے کہ حضرت شیخ الہندؒ جیسے مردم ساز اور مردم شناس، روشن ضمیر شیخ نے اپنے اس عظیم ترین شاگرد کے متعلق کتنا برمحل اور درست اندازہ لگایا تھا۔ نیز اس خط سے آپ کے ساتھ غایت درجہ کا تعلق بھی ایک ایک لفظ سے عیاں ہوتا ہوا محسوس ہوگا۔ خط کی نقل بلفظ ملاحظہ فرمائیے۔

برادر مکرم! بارک اللہ فیکم و سلم

بندہ محمود تسلیمات مسنونہ کے ملتمس ہے، گرامی نامہ پہونچا۔ بندہ کو مادہ سوداوی نے ستار رکھا ہے۔ ایسی حالت میں اپنی رائے پر رہا سہا اعتماد بھی نہیں ہو سکتا۔ آپ جیسے مخلص و مکرم سے اپنا خیال عرض کرنے میں تکلف بھی بیجا ہے۔ خط جو آپ کے پاس گیا اس میں یہ ضعیف بھی واقعی شریک تھا۔ آپ کا خیال درست ہے۔ اول اپنا پریشان خیال آپ پر ظاہر کرتا ہوں پھر استفسار کا جواب عرض کرتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ عالم شہود سے دور برزخ کے قریب ہو رہا ہوں۔ اتنا فکر ضرور ہے کہ استاذ رحمۃ اللہ علیہ سے بفضل اللہ اگر مشافہہ کی نوبت آگئی اور پوچھا کہ کہو مدرسہ کس پر چھوڑا؟ اور کس حالت میں ہے تو اس کا جواب ایسا دے سکوں کہ پسند خاطر حضرت ہو۔ اس کی تدبیر کوئی نہیں مگر یہ کہ اپنے مخلصین صلحاء لائق کے نام گنوا دوں سو آپ کی طرف بھی بچند وجوہ میرا خیال ضرور جاتا ہے اور چاہتا ہوں کہ آپ

جیسے چند اصغر مگر حقیقت میں مفید اور اکبر کسی بہانہ سے احاطۂ مدرسہ میں آنکھوں سے دیکھ لوں. آپ نے جو دو صورتیں تحریر فرمائی ہیں باللہ العظیم ہرگز اس کو پسند نہیں کرتا ہوں کہ آپ مشغلۂ تدریس سے یکسو ہوں بلکہ چاہتا ہوں کہ مشغلۂ تدریس حالتِ موجودہ سے زائد نصیب ہو. میں تو آپ کو جلد بلانے کے لیے تدبیر موجودہ کو دراصل پسند کرتا ہوں. ہرگز مطلب نہیں کہ سید صاحب مشغلۂ علمی سے یکسو ہو کر رسالہ بازی میں عمر صرف کریں.

البتہ یہ ضرور ہے کہ سردست رسالہ کی گاڑی سنبھالنے کو کوئی لائق معتمد علیہ شخص ہو. کچھ عرصہ کے بعد رسالہ کے لیے ان شاء اللہ بہت پیدا ہو جائیں گے. اس وقت رسالہ کی ابتدا اگر ہماری طرز و وضع اور خیال کے خلاف پڑ گئی تو اندیشہ کی بات ہے. اس وجہ سے بیشک یہ مستحسن نظر آیا کہ مکرم سید کو رسالدار بالفعل بنایا جاوے. اس لیے اپنا خیال عرض کرتا ہوں. حکم ہرگز نہیں، آپ کو پسند اور بے تکلف گوارہ ہو تو سبحان اللہ ورنہ جو آپ کو منظور ہو ہم کو منظور ہو گا. اور آپ سے بخدا کوئی خلجان یا ملال کا واہمہ بھی ان شاء اللہ نہ ہو گا. وہ یہ ہے کہ آپ بالکل اپنے مدرسہ کے احاطہ کے اندر اللہ کا نام لے کر آ جائیں اور آہستہ آہستہ کام کیا جائے. انشاء اللہ آپ کے شغلِ تدریس کی ہر طرح سے کوشش کی جائے گی کہ قصور نہ آوے. اور شیخ چلی کا خیال اگر اعتماد کے قابل نہ ہو تو دو ماہ سے چھ ماہ تک کی رخصت لے کر تشریف لا کر رسالہ کو ہمارے کہنے کے مطابق جاری فرما جائیں. اس کے بعد جو صورت آپ پسند فرمائیں اس کے کرنے میں ہم آپ کی موافقت بلکہ متابعت خوشی کے ساتھ کرنے کو موجود ہیں. ان چند روزوں میں جو آپ کو رسالہ کے متعلق تحریرات کی نوبت آئے گی اس کا حساب کیا جائے گا اتنی مدت کی

تالیفات جونپور سے زائد ہوں گی یا کم، سو یہ میرا خبط ہے جو خیال کے قابل نہیں ہے. خوب جانتا ہوں کہ یہاں آپ کسی عنوان سے آئیں مگر غالباً وہ آزادی اور استقلال جو جونپور میں ہے آپ کو بوجوہِ مختلف میسر نہ ہوگا. مگر کیا کروں اپنے خیال خام کی وجہ سے جیسا خود مقید ہوں اپنے لائق مخلصین کو بھی مقید کرنے کا شوق ہوتا ہے.

آپ بالکل مدرسہ اور خدام مدرسہ کے خیر اندیش اور بہی خواہ ہیں. اور ہم خدام مدرسہ بالکل آپ کے خیر طلب اور دعاگو ہیں.

خط آپ ہی ختم ہوگیا. کاغذ ہی نہیں رہا.

والسلام مع الاکرام فقط.

استاذ محترم کے اس خط کے بعد حضرت میاں صاحب بطیبِ خاطر دارالعلوم میں تشریف لے آئے. اہلِ جونپور جو اس عرصہ میں آپ سے بہت زیادہ مانوس ہو چکے تھے، انھوں نے ہر چند اصرار کیا کہ کسی بھی قیمت پر آپ رک جائیں مگر استاذ کا حکم تھا آپ نے نہیں مانا اور تعمیل حکم میں آپ نے وہاں سے تعلق منقطع کرلیا.

یہ طویل خط حضرت شیخ الہند رح کا ہم نے اوپر نقل کیا ہے اس سے یہ اندازہ لگانا زیادہ دشوار نہیں کہ آپ کس بزرگانہ شفقت و محبت دلچسپی اور تعلقِ خاطر کے ساتھ میاں صاحب کو جلد سے جلد اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتے ہیں. سونا کھرا ہو اور اس کو سنار بھی باکمال مل جائے تو پھر اس کی قدر و قیمت میں اضافہ غیر معمولی ہو جانا یقینی ہے. کچھ یہی صورتِ حال یہاں پیش آرہی ہے. دو سال القاسم آپ نے اپنی زیر ادارت ترتیب دیا. آپ کی خدا داد صلاحیت اور غیر معمولی فراست تھی کہ رسالہ اس عرصہ میں ترقی کے مراحل میں تیزی سے آگے بڑھنے لگا. رسالہ کی حالت جب اچھی ہو گئی تو آپ کی خواہش

کے مطابق جلد ہی آپ کو درس و تدریس کا منصب سپرد کر دیا گیا۔ اس منصب پر فائز ہو کر آپ نے تشنگانِ علوم و فنون کو خوب خوب سیراب فرما دیا۔ اسباق کی غیر معمولی پابندی، حشو و زائد سے پاک عارفانہ بیان، طلبہ پر شفقت و مرحمت کا سلوک، یہ سب باتیں تھیں جنھوں نے ہر شخص کو آپ کا گرویدہ بنا دیا۔ طلبا، اور ـ ـ ـ اہلِ شہر اور اہلِ تعلق سب ہی آپ سے استفادہ کے مشتاق رہنے لگے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بعض خاص بندوں کو غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازتے ہیں اور پھر اسی عنوان سے مخلوقِ خدا کو ان سے فیض پہنچتا ہے۔ حضرت میاں صاحب کی ذاتِ ستودہ صفات کو بھی اللہ تعالیٰ نے بہمہ جہت فیض کا ایک چشمۂ صافی بنایا تھا۔ ایک طرف آپ پریشان حال مبتلائے حوادث لوگوں کو تعویذات دے رہے ہیں۔ ایک طرف طلبہ اور علماء آپ سے علمی استفادہ کر رہے ہیں۔ ایک طرف بیعت و ارشاد کے ذریعہ لوگوں کی اصلاح فرما رہے ہیں۔ کہیں مخفی طور پر اہلِ محلہ، اہلِ تعلق کو مالی مدد فرما رہے ہیں۔ اور انداز یہ ہے کہ لینے والے کو بھی پتہ نہیں کہ کس نے مدد کی۔ ان باتوں کو اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم نہ کہیں تو کیا کہیں؟ ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اوپر کی سطروں میں حضرت سید محمد عبد اللہ شاہ صاحب (میاں جی مینے شاہ رحمۃ اللہ علیہ) کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ حضرت میاں صاحب کے والد کے حقیقی ماموں تھے۔ اور انھیں سے آپ نے افتتاحی بسم اللہ کی تھی اور انھیں سے بیعت و تربیت کا تعلق قائم فرمایا تھا۔ میاں جی مینے شاہ رحمۃ اللہ علیہ میاں صاحب کو فرخ سیر کے نام سے یاد فرمایا کرتے تھے اور بہت ۔ ۔ زیادہ محبت فرماتے تھے۔ آپ

جب زیارتِ حرمین شریف کے لیے گئے تو حضرت سید الطائفہ حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ سے ملاقات اور زیارت فرمائی اور اس موقعہ پر میاں صاحب کے والد اور ان کے دونوں لڑکے سید خورشید حسن اور سید اصغر حسین اور ان کے بھانجے سید محمد قاسم صاحب کے لئے تحریری اور زبانی اجازت و بیعت حاصل کرکے لائے حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ نے جو تحریر عنایت فرمائی وہ تبرکاً ملاحظہ فرمائیے۔

"بپاسِ خاطر مخلص مکرم۔ معرفت آگاہ سید محمد عبداللہ شاہ صاحب بیعت مع الاجازت برائے عزیزان شاہ محمد حسن و سید محمد قاسم علی و خورشید حسن و فرخ سیر مقبول و منظور کردہ دعائے خیر اداکردہ شود"

حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کی تحریر کے بعد آپ کے تعلق تربیت میں مزید برکت و رحمت کی شان پیدا ہوگئی اور حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ برابر حضرت میاں جی منے شاہ سے کسبِ فیض کرتے رہے۔ آپ بیمار ہوئے تو وفات سے ایک روز قبل آپ نے میاں صاحب کو اپنے پاس بلایا۔ آپ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سینہ سے کرتا اٹھاکر سینہ سے سینہ ملایا اور دعائیں دیتے ہوئے فرمایا "اصغر تیرے سینہ سے ہزاروں فیض یاب ہوں گے اور مخلوقِ خدا کو تجھ سے فیض پہنچے گا"

بفضلِ خداوندی کہیے اور بزرگوں کی دعائیں اور توجہات کہ حضرت میاں صاحب کی ذات بابرکات سے اللہ کی مخلوق کو اس طرح فیض پہنچا کہ سراپا چشمۂ فیض بن گئے۔ بیرونی حضرات کے علاوہ اہلِ دیوبند بہت زیادہ آپ کی برکات سے متمتع ہوتے تھے

اور مختلف عنوانات سے آپ سے استفادہ کرتے تھے۔ چنانچہ جب ایک مرتبہ سفرِ حج کے لئے آپ نے قصد فرمایا تو یہ افواہ مشہور ہو گئی کہ آپ مستقل ہجرت فرما رہے ہیں۔ اب واپس نہ ہوں گے۔ اس اطلاع کی بنیاد پر بعض ذمہ داران دارالعلوم اور اہلِ شہر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ "ہم نے آپ کی ہجرت کے متعلق خبر سنی ہے۔ آپ کی ذات سے اہلِ شہر اور اہلِ مدرسہ کو بہت زیادہ منافع ہیں۔ آپ تشریف نہ لائے تو یہ فیض کا سلسلہ منقطع ہو جائیگا۔ لہٰذا ہماری نیاز مندانہ درخواست ہے کہ حضرت اس قسم کا قصد نہ فرمائیں۔"

اس پر آپ نے فرمایا یہ خبر غلط ہے۔ البتہ طویل قیام کا ارادہ ہے۔ اس پر بعض بے تکلف حضرات نے عرض کیا کہ حضرت طویل قیام کا قصد بھی نہ فرمائیں۔ بلکہ جلد از جلد ہی ہم خدام کو زیارت و استفاضہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ آپ اس پر خاموش ہو گئے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اہلِ شہر اور اہلِ مدرسہ کو کس درجہ تعلق اور عقیدت حضرت میاں صاحب کی ذات سے تھی۔

نجیب الطرفین سید ہونے کے سبب سخاوت ذکر بخشش اعانت وامداد کا وصف بھی آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ حاجت مندوں کو پورے اخفاء کے ساتھ اس طرح عطا فرماتے کہ کسی کو مطلقاً علم نہ ہو پاتا تھا۔ طلبائے دارالعلوم مفلس وغریب اہلِ محلہ مستقل طور پر آپ سے مستفید ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ سے ایک مرتبہ ایک شخص نے اپنی غربت اور مفلسی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی اس پریشانی کا ذکر کیا کہ جوان لڑکی کا نکاح نہیں کر سکتا۔ اور اس سلسلہ میں کسی سے سوال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے حضرت دعا فرمائیں۔ آپ نے کچھ کپڑا اور کچھ نقدی ایک شخص

کے ہاتھ رات کے وقت اس کے مکان پر بھجوایا اور یہ تاکید فرمائی کہ یہ چیزیں دے کر فوراً واپس ہو جانا۔ وہاں ٹھہرنا نہیں۔ چنانچہ وہ شخص دے کر حسب ہدایت واپس آگیا۔ وہ غریب شخص لوگوں سے پوچھتا رہا کہ کس نے دیا، کس نے امداد کی۔ جب کچھ پتہ نہ چلا تو اس نے حضرت میاں صاحب سے عرض کیا کہ ایک رات کو ایک شخص کچھ روپیہ اور کپڑا میرے مکان پر دے گیا۔ نہ معلوم کوئی فرشتہ تھا کہ کون آج تک پتہ نہیں چلا۔

حضرت نے فرمایا "میاں آپ کو اس کی تلاش کی کیا ضرورت ہے کہ کون دے گیا۔ اور کس نے بھیجے۔ خدا تعالیٰ نے تمہاری مدد فرمائی ہے، اپنے خرچ میں لاؤ"۔

اس قسم کے واقعات بہت ہوتے تھے۔ اکثر غربا، یتیم، مفلس بچے، بوڑھے، عورتیں جمعہ کے دن مختلف اوقات میں آتے تھے۔ اور آپ ان کو کچھ نہ کچھ عنایت فرماتے تھے۔ آخر عمر میں آپ مکان پر ہی طلباء کو درس دیا کرتے تھے۔ غالباً ایک وقت طحاوی شریف زیر درس تھی۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ طلباء حسب معمول حاضر ہوئے تو آپ نے سب ایک ایک چھتری عنایت فرمائی، کہ آپ دور سے آتے ہیں واپسی کے وقت دھوپ ہو جاتی ہے۔ اسی موقعہ پر یہ بھی التزام آپنے فرمایا کہ طلباء جب صبح کو پڑھنے کے لیے حاضر خدمت ہوتے تو آپ ان کے لیے چائے بسکٹ کا اہتمام مستقل طور پر فرماتے رہے۔ سبحان اللہ شفقت و محبت کی یہ کیفیت تھی۔ تبھی تو چھوٹے بڑے جاہل اور عالم سب آپ کے گرویدہ اور شیدا تھے۔ عصر بعد آپ کی عام نشست ہوتی تھی جس میں اہل شہر، اہل مدرسہ اور باہر سے آئے ہوئے حاجت مند زیارت سے مشرف ہوتے اور اپنی اپنی مشکلات کا حل دعا اور تعویذات کی شکل میں پاتے تھے۔ بہت سے حضرات محض زیارت ہی کے لیے حاضر ہوتے تھے۔

غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فیض اور شفا رسانی کے لیے ایک ایسا باہمہ صفت موصوف پیکر جود و کرم، عالم بے بدل، مجسمہ صلاح و تقویٰ بنادیا تھا کہ ہمہ وقت بانواعِ مختلفہ خلقِ خدا آپ سے فیضیاب ہوتی رہتی تھی۔ باہر کے معتقدین خطوط کے ذریعہ آپ سے استفادہ فرماتے تھے۔ اور آپ ان کو بڑی توجہ اور شفقت کے ساتھ فیضیاب فرماتے تھے۔ چنانچہ آج سندھ پاکستان ہی نہیں بلکہ دیگر ممالک میں بھی آپ سے مستفدین کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہوگی، جو آج بھی آپ کے نام لیوا، آپ کے خداکار اور آپ کی مخصوص بزرگانہ شان کو یاد کرتے ہیں تعویذات یوں تو ہر معاملہ میں عنایت فرماتے تھے۔ البتہ سحر اور آسیب میں آپ کے تعویذات اور عملیات بفضل اللہ سو فی صدی کامیاب رہتے تھے۔ جنات وغیرہ کے سلسلہ میں یہ بات آپ کے بارے میں مشہور تھی کہ کسی آسیب زدہ شخص کے سامنے میاں صاحب کا نام لے لیجئے جن بھوت بھاگ جائے گا۔ چنانچہ ایسے واقعات تجربہ میں بھی آئے ہیں۔

خدا رسیدہ بزرگوں کے لیے کشف و کرامت اگرچہ ضروری نہیں ہوتے لیکن ان کی کلاہ افتخار کے لیے طرۂ امتیاز کا درجہ ضرور رکھتے ہیں حضرت میاں صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اس شرف سے بھی بہرہ ور فرمایا تھا۔ بطور مثال یہاں صرف ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ آپ کے پڑوس میں کسی کے یہاں رات کے وقت بچہ کی ولادت ہوئی۔ متفقہ طور پر گھر کے لوگوں نے بچہ کو مُردہ تصور کیا۔ صبح کی نماز میں حضرت میاں صاحبؒ نے صاحبِ خانہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا بچہ زندہ پیدا ہوا تھا اس کو بغیر نہلائے اور بغیر کفن دیئے ہوئے مت دفن کر دینا۔ تمام حاضرین کو حیرت تھی۔ حضرت کو رات میں پیدا ہونے والے بچہ کا علم اور پھر اس کے زندہ یا مُردہ ہونے کی اطلاع کیسے ہوئی؟

ایسے واقعات اور بھی متعدد بار پیش آئے۔ طوالت کی وجہ سے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

ایک مومن کامل ولی باصفا کی پہچان ہی ہوتی ہے کہ اس کی حیات کا ایک ایک گوشہ اتباعِ حق اور متابعتِ رسول کے پرتو سے روشن ہو۔ اس کو دیکھ کر خدا یاد آئے۔ الحب فی اللہ البغض فی اللہ اس کی طبیعتِ ثانیہ بن جائے۔ اس کا ہر ہر عمل صراط مستقیم سے سرمو ادھر ادھر نہ ہو۔ یہ مطلب تو نہیں کہ وہ معصوم ہوتا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ عام لوگوں کی بھیڑ سے ممتاز ضرور ہوتا ہے۔ اور یہ امتیاز اس کو اس کی للٰہیت، خدا ترسی اور اطاعتِ حق کی ہی بدولت نصیب ہوتا ہے اور یہ دولت کسی کو عطا ہو جائے تو پھر اس کی ذات یقیناً "مرجع خلائق"، چشمۂ ہدایت اور بُرہانِ صداقت بن جاتی ہے۔ حضرت میاں صاحب کے نقوشِ حیات پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ؎

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

والا مضمون ہو رہا ہے۔ العظمۃ للہ۔

کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ یہ تو وہ نفوسِ قدسیہ ہیں کہ کچھ بولدیں تو تاریخ بن جائے، دیکھ لیں تو دلوں کو متوجہ کرلیں۔ کوئی قدم اٹھائیں تو کامرانی استقبال کو آئے۔ مگر یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ان میں فروتنی، کسرِ نفسی، سادگی اور اعانتِ خلق اس درجہ ہوتی ہے کہ کسی بھی معاملہ میں اپنے آپ کو نمایاں اور برتر نہیں کرتے۔ حضرت میاں صاحب کو جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان سے پوچھئے کہ وہ ان کی کن کن خوبیوں کو آج یاد کرتے ہیں۔ اور موجودہ زوال پذیر معاشرہ میں زبردست قحط الرجال ہونے کے سبب بجا طور پر انھیں احساس ہوتا ہے کہ اب ایسا درویش باصفا کاہے کو پیدا ہوگا!

ان کی ذات میں مومنانہ جمال، زاہدانہ جلال، درویشانہ سادگی اور عارفانہ نور بیک وقت موجود تھے۔ بلا شبہ اللہ رب العزت نے انھیں اپنی مخصوص رحمتوں سے نوازا تھا۔ ان کی تربیت شروع ہی سے صلاح و تقویٰ کی بنیادوں پر ہوئی۔ بزرگوں نے انھیں جس طرح عزیز رکھا۔ قدرت نے ابتدا ہی سے جس طرح بے سر و سامانیوں میں انکی دستگیری فرمائی، یہ اشارے تھے اس بات کے لیے کہ آج کا یہ معمولی طالب علم کل کا مرشد طریقت اور مقتدائے انام بننے والا ہے۔ قدرت کے نوازنے کے انداز بالکل نرالے ہوتے ہیں۔ کوئی ان کو سمجھ لے تو اندازوں سے سمجھ لے۔ ورنہ عام طور پر پردۂ غیب سے بعض ایسی عجیب و غریب صورتیں ظاہر ہوتی ہیں کہ ان میں کوئی منطقی ربط نہیں محسوس ہوتا۔ اور بے ساختہ ایسے موقعوں پر اللہ تعالیٰ کے قادرِ مطلق، مدبّر امر ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔

حضرت میاں صاحب کی حیاتِ مبارکہ میں آپ کی ذات سے خلقِ خدا کو جس طرح فیض پہنچتا تھا ان کا اخلاص کہیے اور للّہیت کہ آج تک وہ فیض مختلف عنوانات سے جاری و ساری ہے۔

آپ کی اولاد و احفاد میں آپ کے لائق صاحبزادگان اور آپکے لائق پوتے بجا طور پر آپکی علمی فیوض و برکات کے امین اور آپکی قابلِ فخر روایات کے امین بنے ہوئے ہیں۔ اور کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے بندوں کے اعمال و اقدامات میں کس طرح برکت عطا فرماتا ہے۔ اور ان کے بعد بھی ان کے نام کو کس طرح زندہ و درخشں رکھتا ہے۔ ایک بار پھر کہنے کا موقع دیجیئے کہ رب العزت جس کو نوازتے ہیں اس کے ڈھنگ بالکل نرالے ہوتے ہیں۔ مگر ٹھہریئے! یہ سب کچھ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی خوش قسمت انسان اطاعتِ حق کے لیے اپنے آپ کو وقف

کر دیتا ہے۔ اور شاید یہی مطلب ہے حدیث کے اس مبارک جملہ کا:۔

مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ

حضرت ۱۲۹۳ھ میں پیدا ہوئے ایک لمبے عرصے تک دارالعلوم میں خدمت کی۔ اور ۲۲ محرم ۱۳۶۴ھ میں آپ نے انتقال فرمایا۔ راندیر ضلع سورت میں آپ کا مزار پُر انوار عقیدت مندوں کی زیارت گاہ ہے۔

کہنے والوں سے بہت ہم کو سنے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کرے گی دنیا

شیخ الاسلام

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی

نور اللہ مرقدہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (نور اللہ مرقدہ)
کی ذاتِ گرامی اپنی علمی و عملی عظمت، اپنے مجاہدانہ کارناموں، اپنے اتقاء
اور پرہیزگاری، اپنے اخلاقی بلندی، اپنی خدا ترسی، دینی و ملی غیرت اور دیگر
محاسن کی بناء پر ہمیشہ یاد رہے گی۔

حضرت شیخ کیا تھے؟ ان کا مقام بلند کیا تھا، اس پر بہت کچھ لکھا
گیا ہے اور بہت کچھ لکھے جانے کی گنجائشیں باقی ہیں اور باقی رہیں گی۔ جو
شخصیتیں دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد بھی لوگوں کے سینوں میں اور تاریخ
کے صفحات میں زندہ رہتی ہیں حضرت شیخ مدنی بھی ان ہی ستودہ صفات
بزرگوں میں سے ایک تھے۔

راقم الحروف نے حضرت نانوتویؒ، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت انور شاہؒ،
حضرت تھانویؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رح کو نہیں دیکھا بلکہ ان کے
تذکرے یا واقعات پڑھے یا سُنے ہیں۔ لیکن میں یہ بات فخر کے ساتھ

کہوں گا کہ میں نے حضرت شیخ مدنی کو جی بھر کے دیکھا اور سنا ہے. میں احتیاط لیکن ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت شیخ مدنی رح اپنے اکابر اور اسلاف کی خوبیوں، نیکیوں اور ان کی بلندیوں کا ایک حسین مجموعہ تھے. وہ انسانیت کی مابہ الامتیاز خصوصیات کے حامل تھے باطل کے خلاف پوری جرأت اور ہمت کے ساتھ آواز اٹھانے والے مجاہد تھے. ہزاروں لاکھوں لوگوں کو جادۂ ہدایت پر لگا دینے والے شیخ طریقت تھے ہزاروں لاکھوں طلباء کو علوم دینیہ سے مستفید کرنے والے شیخ تھے. بے شمار بے سہارا لوگوں کے لئے ظاہری سہارا تھے.

حق تعالیٰ نے انھیں فیض رسانی اور رحمتِ ربانی کی ایک علامت بنایا تھا. میں نے کسی بزرگ کا مقولہ سنا ہے کہ ولی کی پہچان یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر خدا یاد آئے، حضرت مدنی رح پر یہ بات صادق آتی ہے. حضرت کی زیارت کر کے واقعی خدا یاد آتا تھا. حضرت کی مجلس میں بیٹھ کر دل میں ایک طرح کی طمانیت محسوس ہوتی تھی. ایک ایسی کیفیت جس کو روح کی آسودگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، حضرت مدنی کے یہاں میسر آتی تھی. میں دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پاتا تھا. ۱۳۷۲ھ میں جب دورۂ حدیث کی منزل تک پہنچا تو وفورِ شوق کا ایک عجیب عالم تھا حضرت کو اب تک مجلس میں گفتگو فرماتے یا جلسوں میں تقریر فرماتے سنا اور دیکھا تھا، درسگاہ میں قریب سے دیکھنے کا شوق پورا ہونے کا اب موقع تھا. حضرت نے بخاری شریف کا درس شروع فرمایا. بخاری شریف جیسی بابرکت کتاب حضرت مدنی رح جیسا شیخ وقت اور ولیٔ کامل پڑھانے والا رحمت و برکت کا کیا سماں ہوتا ہوگا. اس کو اہلِ دل اور اہلِ علم ہی سمجھ سکتے ہیں. مجھ جیسا کم سواد طالب علم حضرت شیخ کی علمی وسعتوں کو کیسے اور کیا سمجھ پاتا. بس سبق میں حضرت

شیخ کی زیارت کرتے رہنا ہی میرے شوق کی منزل تھی اور یہی میرا سبق تھا. حضرت درس میں تقریر فرماتے تو محسوس ہوتا کہ علم کا بے پایاں سمندر موجیں مار رہا ہے یا علم و عرفان کی ہلکی ہلکی بارش دلوں کو سیراب کر رہی ہے. دورانِ درس طلبہ پوری بے تکلفی کے ساتھ سوالات کرتے اور حضرت پوری توجہ اور بشاشت کے ساتھ جوابات دیتے تھے. دورانِ درس محسوس نہیں ہوتا تھا کہ یہ وہی بطلِ جلیل اور شیخ وقت ہے جس کے سامنے بڑوں بڑوں کو لب کشائی کی جرأت نہیں ہوتی. طلبہ بعض اوقات مہمل سوالات کرتے مگر آپ ناراض نہیں ہوتے بلکہ پوری شفقت کے ساتھ مطمئن فرماتے تھے. بطور مثال ایک واقعہ ذکر کروں گا، جس سے حضرت کی کسر نفسی بھی ظاہر ہوتی ہے اور مطمئن کرنے والا انداز بھی نمایاں ہوتا ہے. کسی طالب علم نے بخاری شریف کے سبق میں حضرت کو ایک پرچی لکھی جس میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں تھی. اور اس میں حضرت کو "شیخ الاسلام" کے لقب کے ساتھ مخاطب کیا تھا جو حضرت کے لئے عوام و خواص سب ہی استعمال کرتے تھے. حضرت نے پرچی پڑھی اور "شیخ الاسلام" لکھا ہوا دیکھ کر ناراض ہوگئے. فرمایا "یہ پرچی کس نے لکھی ہے. لکھنے والے نے اپنا نام نہیں لکھا تھا. اس لئے جس نے لکھی تھی وہ ندامت سے محفوظ رہا. اسکے بعد حضرت نے فرمایا. آپ حضرات لایعنی سوالات کر کے سبق کا نقصان کرتے ہیں اور ستم یہ ہے کہ مجھ جیسے شخص کو آپ شیخ الاسلام لکھتے ہیں. آپ کو نہیں معلوم کہ شیخ الاسلام کا لقب کن شرائط کے ساتھ کس شخص کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو اس کی شرائط علماء نے لکھی ہیں وہ ہرگز ہرگز مجھ میں موجود نہیں ہیں. آپ حضرات ایسے الفاظ میرے لئے استعمال نہ کیا کریں، میں ایک بہت معمولی آدمی

ہوں۔ اپنے بزرگوں کا نام لیوا ہوں۔ انھیں کی جوتیوں کے صدقے میں چند حرف پڑھانے کے قابل ہوا ہوں۔ حضرت نے بطور انکساری جو کچھ فرمایا وہ ایسی دلسوزی اور اخلاص سے فرمایا کہ مجمع پر رقت طاری ہو گئی اور درسگاہ میں سناٹا چھا گیا۔ اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ شیخ الاسلام اگر آپ مجھے اس معنیٰ میں کہیں کہ "میں مسلمانوں کا بڈھا ہوں"، تو کوئی حرج نہیں۔ یہ جملہ سُنکر طلبہ ہنس پڑے اور درسگاہ میں جو سنجیدگی کی بوجھل سی فضا بن گئی تھی وہ نشاط و مسرت کی بزم اور دل پذیر فضا میں تبدیل ہو گئی۔ یہ بطور مثال ایک واقعہ ہے۔ اس قسم کے واقعات بہت مرتبہ پیش آتے تھے۔ اور ان سے حضرت کے علو مرتبت، منکسر المزاجی، شفقت و رحمت، عظمت و بزرگی کا اظہار ہوتا تھا۔

درس و تدریس کے علاوہ عام مسلمانوں کی اصلاح و ہدایت کے لئے آپ نے اپنے کو وقف کر رکھا تھا۔ رات دن سفر فرماتے جلسوں میں وعظ فرماتے۔ لوگ بیعت ہونے کی خواہش کرتے آپ ان کو بیعت فرماتے۔ خلافِ شرع امور سے بچنے کی مسلمانوں کو تلقین فرماتے دین کے مطابق زندگی بنانے کی نصیحت فرماتے۔ خلافِ شرع کسی کام پر آپ کا نکیر کرنا خالصۃً لوجہِ اللہ ہوتا تھا۔ اس میں کسی ذاتی میلان کو دخل نہیں ہوتا تھا، گویا ایسے موقعہ آپ "البغض فی اللہ" کا مظہر ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ سبق سے فارغ ہو کر آپ اپنے مکان پر تشریف لے جا رہے تھے مکان پر پہنچے تو دروازے پر ایک شخص کو کھڑا پایا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑے کاغذ کے تھیلے میں مٹھائی تھی۔ اس نے وہ مٹھائی حضرت کو پیش کی۔ حضرت نے پوچھا یہ مٹھائی کیسی ہے؟ اس شخص نے عرض کیا حضرت بچے کی بسم اللہ کروائی تھی، اس کی خوشی میں یہ مٹھائی حضرت کی خدمت میں لایا ہوں۔ حضرت نے

انتہائی غصہ اور خفگی کے لہجہ میں ڈانٹتے ہوئے فرمایا تمہیں شرم نہیں آتی تم داڑھی منڈاتے ہو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت سے تمہیں نفرت ہے اور میرے پاس مٹھائی لے کر آئے ہو، یہ سُن کر وہ شخص کانپ گیا۔ شرمندگی سے اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے عرض کیا۔ حضرت میں معافی چاہتا ہوں۔ اور وعدہ کرتا ہوں انشاءاللہ آئندہ داڑھی نہ منڈاؤں گا۔ حضرت نے فرمایا۔ پکا وعدہ کرتے ہو۔ اس نے جواب میں کہا حضرت بالکل پکا وعدہ کرتا ہوں۔ اتنا سنتے ہی حضرت نے فرمایا "لاؤ اب تمہاری مٹھائی قبول کروں گا" انتہائی بشاشت اور مسرت کے ساتھ آپ نے وہ تحفہ قبول فرمالیا۔ چہرے پر نمایاں ہونیوالی خوشی کی تازگی ظاہر کر رہی تھی کہ ایک شخص کے مائل بہ اصلاح ہونے سے آپکو دلی مسرت ہوئی ہے۔ اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جو حضرت مدنی کی مومنانہ زندگی کو تابناک بناتے ہیں۔

آزادیٔ وطن کے لیے حضرت نے جو بے مثال قربانیاں دیں وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، مالٹا میں اپنے استاذِ محترم حضرت شیخ الہند رح کی معیت میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں ہندوستان کی مختلف جیلوں کو آباد کیا۔ انگریز جیسے جابر و قاہر حکمرانوں سے پوری جرأت و ہمت سے نبرد آزما ہوئے۔ اپنوں اور غیروں کے طعنے اور گالیاں سُنیں مگر جس بات کو حق سمجھا اس سے دستکش نہیں ہوئے۔ پوری قوت کے ساتھ اس پر جمے رہے۔ آج کل نئی نسل جو آزادی کے بعد جوان ہوئی ہے وہ شاید مولانا کے مقام بلند سے کما حقہٗ واقف نہ ہو مگر وہ لوگ جنھوں نے حضرت کے مجاہدانہ کارناموں کو دیکھا یا سُنا اور پڑھا ہے وہ یقیناً اس کی شہادت دیں گے کہ حضرت مدنی کا مقام

جدو جہد آزادی کی تحریک میں اور آپ کی مخلصانہ قربانیاں اس بلند
مقصد کے لیئے کسی بھی بڑے سے بڑے لیڈر کسی بھی بڑے سے بڑے راہبر سے
کم نہیں ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ علمائے حق کا یہ پاکباز طبقہ ہی تھا جس نے
جنگ آزادی میں جان و مال کی بے مثال قربانیاں دیکر ہندوستان
کو آزادی کی نعمت سے ہمکنار کیا۔ مقدسین کی یہ جماعت جس کے ایک عظیم
فرد حضرت مدنی بھی تھے، یہ اگر نہ ہوتی اور سر سے کفن باندھ کر وقت کی
ظالم حکومت سے نبرد آزما نہ ہوتی تو آزادی کی منزل ابھی دور تھی۔

پھر بہت زیادہ قیمتی بات یہ ہے کہ حضرت مدنی رحہ نے جتنے
کچھ مصائب آزادئ وطن کی خاطر جھیلے اس کا کوئی صلہ کسی صورت میں
کسی سے نہیں لیا ملک آزاد ہوا تو آپ ہدایت و اصلاح تعلیم و تدریس
رشد و ہدایت کے مبارک کام میں ہمہ تن مشغول ہوگئے۔ آزادی کی صبح
مسلمانوں کے لیئے نت نیئے مصائب اور غیر معمولی حوادث کی آندھیاں اپنے
ساتھ لے کر آئی۔ مسلمانوں کے لیئے عرصۂ حیات تنگ ہوگیا۔ جو لوگ
جا سکتے تھے وہ پاکستان چلے گئے۔ جو نہ جا سکتے تھے وہ یہاں مشکلات
اور مایوسیوں کی دھند میں بے یار و مددگار سے ہو کر رہ گئے۔ ہندوستان
میں مسلمان "نہ جائے رفتن نہ پائے رفتن" کی تصویر بن کر رہ گیا۔
عدمِ تحفظ کے احساس نے زندگی کا حوصلہ ختم کر دیا۔ ایسے نازک وقت اور
ایسے صبر آزما حالات میں صرف دو نام ایسے نظر آتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ
نے مسلمانوں کا ظاہری سہارا بنا کر یہاں ثابت قدم رکھا۔ ایک حضرت
مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، دوسرے مجاہدِ ملت حضرت مولانا
حفظ الرحمٰن صاحب۔ ان دونوں بزرگوں نے تمام تر مشکلات کے باوجود
مسلمانوں کو یہیں رہنے اور جینے کا مشورہ دیا۔ فسادات کی ہولناک آگ
میں دور سے نہیں بلکہ اُس میں گھس کر اس کو بجھانے کی بھی کوشش کی

اوران کے زخموں پر مرہم بھی رکھا اور آئندہ ان کو باعزت طور پر زندہ رہنے کا حوصلہ بخشا. حضرت مدنی نے ایسے دہکتے ہوئے اور بھپکتے ہوئے ماحول میں اپنی تقریروں کا موضوع ہی یہ بنالیا، کہ خدا پر بھروسہ رکھو، ناامید نہ ہو گھبرا کر یہاں سے نہ بھاگو، یہ تمہاری مسجدیں، یہ تمہارے مدرسے یہ تمہاری خانقاہیں، یہ تمہارے مزارات، یہ تمہارے تاریخی آثار تمہیں پکار پکار کر یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں چھوڑ کر چلے جاؤ گے تو ہمیں آباد کرنے کون آئے گا؟"

راقم الحروف نے ایسی بہت سی تقاریر حضرت کی سُنیں ہیں جن میں مسلمانوں کو استقامت اور ثبات قدمی کی تلقین کی گئی تھی. دیوبند کی جامع مسجد میں آپ نے ایک مرتبہ تاریخی تقریر فرمائی جس میں مسلمانوں کو بڑے مؤثر انداز اور بڑی ہی دلسوزی مگر پورے اعتماد اور اخلاص کے ساتھ مسلمانوں کو حالات کا مقابلہ کرنے اور ایک اچھے اور سچے مسلمان کی طرح یہاں جمے رہنے کا مشورہ آپ نے دیا. اس تقریر نے جو بعد میں طبع کرا کر عام مسلمانوں تک پہنچائی گئی، اس نے جلتی ہوئی آگ پر پانی کا کام کیا. شکستہ دلوں میں امید اور اعتماد کی لہر چمکی اور نہ جانے کتنے لوگ جو پاکستان جانے کے لئے پا بہ رکاب تھے وہ یہیں قیام پذیر ہو گئے. آج ہندوستان میں جو مسلمان آباد نظر آتے ہیں وہ بظاہر اسباب انہی دونوں بزرگوں کی تلقین و تقریر، نصیحت و ہدایت کے نتیجہ میں نظر آتے ہیں. مشیتِ ایزدی نے حضرت مدنی رح کو بطور خاص اس درماندہ مایوس اور پاشکستہ قوم کا مسیحا بنا دیا تھا. آزادی سے پہلے آزادئ وطن کے لئے انگریزوں سے برسرِپیکار رہے. آزادی ملی تو اپنی قوم کو سہارا دینے اس کی ہمت بندھانے اس کو تباہیوں سے بچانے میں اپنے جسم و جان کی تمام تر توانائیوں کو لگا دیا. گویا حضرت

کی پوری زندگی جہادِ مسلسل سے عبارت تھی۔

حضرت کی مومنانہ زندگی کے بہت سے ایسے خوبصورت پہلو ہیں جو اپنی جگہ بے حد دلنواز، بے حد اہم اور بہت زیادہ قابلِ توجہ ہیں اور لکھنے والوں نے ان پہلوؤں کو اجاگر بھی کیا ہے۔ آج کی گندی سیاست جس کا تذکرہ بھی آج ایک بھلا آدمی مناسب نہیں سمجھتا حضرت مدنی نے اپنی بے داغ سیاسی زندگی سے یہ ثابت کیا کہ سیاست ایثار و قربانی کا نام ہے۔ جلبِ منفعت اور حصولِ اقتدار کی محض ایک سیڑھی نہیں ہے۔ یہ غرض مندی اور نفع اندوزی کا دوسرا نام نہیں ہے۔ آپ نے اپنی ایماندارانہ اور مخلصانہ سیاسی کردار سے یہ ثابت کیا کہ سیاست خود بری چیز نہیں۔ برے لوگ اس کو برا بنا دیتے ہیں۔ حضرت مدنی رح کا یہ کمالِ اخلاص تھا کہ سیاسی میدان میں جنگِ آزادی کے محاذ پر مسلسل اور غیر معمولی قربانیاں دینے کے بعد جب وطن آزاد ہوا تو یکسو ہو کر اپنے علمی اور اصلاحی کام میں مشغول ہو گئے۔ اور اپنی خدمات اور مجاہدوں کا کوئی صلہ کسی سے لینا پسند نہیں فرمایا۔ چاہتے تو عزت و اقتدار، مال و منال کی بڑی سے بڑی مقدار حاصل کر سکتے تھے۔ اس لئے کہ اپنے مقام و منصب اور اپنی خدمات کے اعتبار سے وہ کسی سے کم نہیں تھے۔ ۱۹۵۵ء میں صدر جمہوریہ راجندر پرشاد نے آپ کو "پدم بھوشن" کا خطاب عطا کیا تو آپ نے اس کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس قسم کے خطابات قبول کرنا میرے بزرگوں کی روایات کے خلاف ہے، اس لئے میں اس کو قبول نہیں کر سکتا۔

آزادی کے بعد رونما ہونے والے واقعات سے آپ بہت ملول اور دل گیر تھے۔ اور اپنے قلبی رنج و غم کا برملا اپنی تقریروں میں بھی اظہار فرماتے تھے۔ اور اپنی نجی گفتگو میں بھی بلا تکلف اس کو ظاہر

فرما دیا کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے۔ یو پی میں پنتھ جی وزیرِ اعلیٰ تھے اس وقت توہینِ رسولؐ کا واقعہ پیش آیا۔ تمام مسلمان اس سے متأثر اور مشتعل ہوئے۔ حضرت مدنیؒ نے اس موقعہ پر دارالعلوم دیوبند میں ایک تقریر کی، تقریر کیا تھی دل کے داغ تھے جو الفاظ کی شکل میں ظاہر ہو رہے تھے۔ آپ نے شدید غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ہم نے آزادی کے لئے اس واسطے قربانیاں نہیں دی تھیں کہ ہمارے مذہب یا ہمارے مذہبی پیشوا اور پیغمبروں کی توہین کی جائے۔ اگر حکومت نے اس کو روکنے کی کوشش نہ کی اور گستاخی کرنے والے شخص کو قرار واقعی سزا نہ دی تو سول نافرمانی کرتے ہوئے جو شخص سب سے پہلے جیل جائے گا وہ "حسین احمد" ہوگا۔ ہم انگریزوں کی جیلوں سے نہیں ڈرے اب کیا ڈریں گے۔

حضرت مدنی رہ ایک مومن کامل، ایک عالم باعمل اور مخلص رہنما تھے۔ اس لئے جو بات اصول یا حق کے خلاف ہوتی تھی اس کو قطعاً برداشت نہیں کرتے تھے۔ اس مردِ حقانی کی یہی شان تھی اس کی یہی ادائے مومنانہ تھی، جس کی مثال اب ڈھونڈے نہیں ملتی ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا۔ حضرت ۱۳۳۷ھ کے بعد کلیتاً اصلاح و ارشاد اور تبلیغ و تلقین کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ قریہ قریہ، شہر در شہر تشریف لے جاتے اور اپنے وعظوں میں مسلمانوں کو دین و شریعت کے مطابق زندگی گذارنے کی نصیحت فرماتے۔ مدرسوں کے جلسوں میں تشریف لے جاتے اور اس کی بالکل پروا نہ فرماتے کہ سفر میں راحت ملے گی یا زحمت ہوگی۔ بسا اوقات ایسے دیہات میں لوگوں کی دعوت پر تشریف لے جاتے جہاں راستہ کچا ہوتا اور وہاں جانے میں بڑی پریشانی ہوتی۔ مگر آپ کبھی حرفِ شکوہ زبان پر نہ لاتے۔

ایسے بہت سے واقعات حضرت سے منسوب ہیں کہ باوجود اپنے بڑھاپے کمزوری اور بیماری کے جلسوں میں دعوت دینے والے اصرار کے ساتھ آپ کو جلسوں میں لے جارہے ہیں۔ اور حضرت تمام مشقتوں اور سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے تشریف لے جارہے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ دین کی بات، ایمان کی بات لوگوں تک پہنچ جائے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا کہ دعوت دینے والے عرض کرتے کہ حضرت ہمارے یہاں چھوٹا سا مدرسہ ہے لوگوں کو اس کی طرف توجہ نہیں ہے۔ آپ تشریف لے جائیں گے تو مدرسہ کی طرف لوگوں کو توجہ ہو جائیگی مدرسہ آباد ہو جائے گا۔ مدرسہ آباد ہو جائے گا تو بستی میں علمِ دین کی اشاعت کا سلسلہ چل نکلے گا۔ بس اتنا کہدینا حضرت کے لئے کافی تھا علاوہ کسی شدید مجبوری کے فوراً منظوری عطا فرما دیتے تھے۔ راقم الحروف کے ساتھ خود اس قسم کا واقعہ پیش آیا۔ ایک چھوٹی سی بستی کے مدرسہ کے ذمہ دار دیوبند آئے۔ کہنے لگے حضرت سے جلسے کی تاریخ لینا چاہتے ہیں تم ہمارے ساتھ چلو۔ ہمیں حضرت سے بات کرنے کی ہمت نہ ہو پائے گی۔ میں نے اُن سے کہا یہ مجبوری تو میرے ساتھ بھی ہے یعنی بات کرنے کی ہمت تو میں بھی اپنے اندر نہیں پاتا، تاہم تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ پرچہ لکھ کر عرض مدعا کریں گے۔ غرض بعد ظہر حضرت کی مجلس میں حاضری ہوئی۔ پرچہ حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ جواب میں ارشاد فرمایا کہ میں بیمار بھی ہوں اور کوئی تاریخ جمعرات کی کئی مہینے تک خالی نہیں ہے۔ حضرت کا معمول یہ تھا کہ اسباق کے حرج سے بچنے کے لئے عام طور پر آس پاس کے سفر جمعرات کو فرماتے۔ تاکہ شنبہ تک دیوبند تشریف لے آئیں اور سبق پڑھا سکیں۔

غرض یہ کہ حضرت نے انکار فرما دیا۔ وہ صاحب جو داعی تھے انھوں نے عرض کیا حضرت ہماری چھوٹی سی بستی ہے وہاں ایک قدیم مدرسہ ہے مگر کس مپرسی کا شکار ہے۔ تمام گاؤں والوں کی دلی تمنا بھی ہے کہ حضرت کی زیارت سے مشرف ہوں۔ نیز حضرت کی تشریف آوری سے مدرسہ میں بھی جان پڑ جائے گی۔ مدرسہ کی طرف لوگوں کو کچھ توجہ بھی ہو جائے گی۔

حضرت نے جواباً فرمایا کہ ,, آپ لوگوں کو مجھ بیمار بڈھے پر رحم نہیں آتا۔ میرے گھٹنوں میں تکلیف ہے۔ اٹھنے بیٹھنے میں دشواری محسوس کرتا ہوں۔ نیز سفر کرنے سے سبق کے ناغہ ہونے کا اندیشہ بھی رہتا ہے میں یہاں پڑھاؤں یا جلسوں میں جاؤں،،

حضرت کے اس جواب پر داعی نے اپنے دیہاتی لب لہجہ میں سادگی کے ساتھ کہا۔ حضرت میں کچھ نہیں جانتا مجھے تو کوئی تاریخ ضرور ہی دینی پڑے گی، میں گاؤں والوں کو کیا جواب دوں گا جو میرا انتظار کر رہے ہیں۔ حضرت جی آپ کو اللہ نے فیض کا دریا بنا دیا ہے آپ ہمیں کیوں محروم فرماتے ہیں؟"

حضرت نے اس جواب پر اس شخص کو تاریخ دیدی۔ حضرت وہاں تشریف لے گئے، وعظ فرمایا۔ حضرت کے وعظ کو سن کر اور آپ کی زیارت کر کے عام طور پر لوگوں کو یہ کہتے سُنا کہ ہم یہ سمجھتے تھے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اب کوئی عالم ربانی باقی نہیں رہا ہے۔ مگر حضرت کی زیارت کے بعد ہمیں اندازہ ہوا ہے کہ حضرت کی ذات گرامی بلاشبہ مسلمانوں کے لیے، اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ میں نے یہ واقعہ اس واسطے عرض کیا کہ حضرت کا مقام بلند اور عظمت نمایاں ہو جائے،،۔

جتنا اللہ نے حضرت کو عظمت و عزت عطا فرمائی تھی اتنا ہی آپ تواضع اور انکساری اختیار فرماتے تھے۔ مجلس میں عام طور پر ایسی جگہ بیٹھتے جو "صدر نشین" سے ہٹ کر ہوتی۔

آپ کی آمد کے موقعہ پر اگر کوئی تعظیماً کھڑا ہو جاتا فوراً اس پر شدید ناگواری ظاہر فرماتے: اور جب تک کھڑا ہونے والا بیٹھ نہ جاتا آپ بھی کھڑے رہتے۔ ارشاد فرماتے۔ حدیث میں اس سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے لاتقوموکما تقوم الاعَاجم (عجمیوں کی طرح کھڑے مت ہو) اگر جلسے وغیرہ میں کوئی شخص آپ کی تعریف میں نظم پڑھنے کی کوشش کرتا تو سختی سے اس کو روک دیتے تھے۔ غرض مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ (جو شخص اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اس کو سربلند فرماتا ہے) کی آپ ایک روشن مثال تھے۔

حُبِّ دنیا آپ کو چھو کر نہیں گذری تھی۔ کوئی شخص سفر یا حضر میں کوئی رقم پیش کرتا تو انکار فرما دیتے"۔ جلسے وغیرہ میں داعی مصارفِ سفر پیش کرتے تو اتنا ہی قبول فرماتے جتنا سفر میں صرف ہوتا۔ جو اس سے زائد ہوتا واپس فرما دیتے۔ ایسے واقعات کے مشاہدین اب بھی بہت لوگ ہوں گے۔ لیکن ایک مرتبہ ایک جگہ اس کا مشاہدہ خود میں نے کیا۔ جلسے میں تشریف لے گئے۔ واپسی کے موقعہ پر میزبان نے بطور مصارفِ سفر کچھ روپے پیش کئے آپ نے اتنے ہی روپے قبول فرمائے جتنے سفر میں خرچ ہوئے تھے، باقی واپس کر دیئے۔

غرض یہ کہ ترکِ دُنیا اور تواضع بھی آپ کی پاکیزہ سیرت کا ایک امتیاز خصوصی تھا۔ واقعات کی تفصیل میں جایا جائے تو اس کے لئے

بڑی گنجائش درکار ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ آپ کی سیرت کے ایک ایک رُخ پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی گنجائش ہے مگر یہاں اس سے زیادہ کا موقعہ نہیں ہے۔

آپ کی پیدائش شوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء بانگر مئو ضلع اناؤ میں ہوئی۔ آپ کے والد بزرگوار سیّد حبیب اللہ صاحب نے ماہِ صفر ۱۳۰۹ھ میں حصولِ تعلیم کے لئے دیو بند بھیجدیا تھا۔

آپ کے اساتذہ میں مولانا حبیبُ الرحمٰن صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیو بند، مولانا منفعت علی صاحبؒ، مولانا غلام رسول صاحبؒ، مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ، مولانا خلیل احمد صاحبؒ، مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ، مولانا عبد العلی صاحبؒ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ جیسے جلیل القدر بزرگ شامل ہیں۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد ایک عرصہ تک مدینہ منورہ میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ دارالعلوم میں تقریباً بتیس ۳۲ برس درسِ حدیث دیا۔ ہزاروں طلباء کو چشمۂ علم سے فیضیاب فرمایا۔

۱۳۱۶ھ میں قطب العالم حضرت گنگوہیؒ سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ اس کے بعد مکہ معظمہ حاضری کے موقعہ پر سیّد الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے کسبِ فیض کیا، جو حضرت مولانا قاسم صاحبؒ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رہ کے پیر و مرشد تھے۔ غرض آپنے حضرت حاجی صاحبؒ اور حضرت گنگوہی رہ دونوں سے اجازتِ بیعت حاصل فرمائی۔ اور حضرت مدنی رہ نے ان دونوں ہی بزرگوں سے روحانی اور باطنی فیض حاصل کیا۔ ایسے باکمال بزرگوں سے جس کو اکتسابِ فیض کا موقعہ مل جائے وہ محروم کیسے رہ سکتا ہے چنانچہ علم و عمل، تقویٰ و طہارت، خلوص و للّٰہیت، تواضع و انکساری، اتباعِ

قرآن و سنت کی یہ خوبصورت تصویر جس کو مشیئت نے حسین احمد کا پیکرِ خاکی عطا کیا تھا، وہ اپنے بزرگوں کی آنکھوں کا تارا، وہ اپنی ملت کا مخلص راہ نما، وہ طالبانِ علم نبوت کا مربی اور استاذ، وہ سالکینِ راہِ حق کا مرشد، وہ اپنے اسلاف کے کمالات کا جامع، وہ ولایت و ہدایت کا دیدہ ور رہبر کامل، وہ اپنے ظاہری اور باطنی کمالات کی روشنی بکھیرتا ہوا ۵ / دسمبر ۱۹۵۷ء کو عدم کی پہنائیوں میں گم ہوگیا۔ وہ شیدائے حق، آسودۂ رحمتِ حق ہوگیا۔

بَرَّدَ اللهُ مَضْجَعَهُ وَجَعَلَ الْجَنَّةَ مَثْوَاهُ۔

ذکرِ طیب

حکیم الاسلام

حضرت مولانا قاری محمدؐ طیب صاحب

نوّر اللہ مرقدہٗ

۱۷ر جولائی ۸۳ء اتوار کا دن تھا۔ ساڑھے دس بجے کے قریب طبیعت چاہی کہ حضرت مہتمم صاحب کی زیارت کیجئے، بہت دن ہو گئے، حضرت کی زیارت کے لئے جانا چاہیے۔ اس سے پہلے کئی مرتبہ ارادہ کیا مگر پورا نہ ہو سکا۔ چنانچہ میں حضرت کے دولت کدہ پر پہنچا، اطلاع کرائی، خدمت میں حاضر ہوا۔ سلام و مصافحہ کے بعد خیریت دریافت کی، تو فرمایا "پہلے سے قدرے بہتر ہوں" میں چارپائی کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ مختلف امور پر حضرت گفتگو فرماتے رہے۔ ٹھہر ٹھہر کر بولتے رہے۔ لہجہ اور انداز سے کمزوری تو عیاں تھی مگر یہ گمان نہ تھا کہ تقریباً ایک گھنٹہ بعد حضرت رب اکبر کے حضور جوارِ رحمت میں پہنچ جائیں گے۔ میں پندرہ بیس منٹ بیٹھ کر سلام و مصافحہ اور دعا کی درخواست کرکے واپس آگیا گھر پر پہنچ کر حضرت سے ملاقات کا تذکرہ کر رہا تھا۔ اور اپنی اس

خوش بختی پر بہت خوش تھا کہ آج حضرت کی زیارت بھی ہوگئی اور حضرت کے کلمات طیبات سے مستفید ہونے کا موقع بھی مل گیا۔ ابھی میں یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ اچانک ایک چھوٹی سی بچی نے آکر اطلاع دی کہ حضرت کا انتقال ہوگیا ہے۔ سُنکر کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ فوراً باہر آیا دیکھا کہ لوگ مہتمم صاحب کے مکان کی سمت بھاگ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہوگیا کہ جس بات کا دھڑکا بہت دنوں سے لگا ہوا تھا، وہ ہوچکی ہے۔ تیزی سے حضرت کے مکان کی طرف چلا، بیقرار لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو حضرت کے مکان پر جمع تھا۔ بقدرِ تعلق ہر شخص متاثر تھا۔ بعض لوگ زار زار رو رہے تھے۔ بعض سسکیاں بھر رہے تھے۔ بعض تصویرِ غم بنے خاموش تھے۔ ہجوم برابر بڑھ رہا تھا۔ ہر شخص کو اشتیاق تھا کہ حضرت کی زیارت کرے۔ چنانچہ انتظام کیا گیا کہ لوگ ایک طرف سے زیارت کرتے ہوئے دوسری طرف سے نکل جائیں۔ یہ سلسلہ دوپہر سے لے کر رات کے دس بجے تک جاری رہا۔ اور نہ جانے کب تک یہ سلسلہ جاری رہتا لیکن چونکہ تدفین میں تعجیل ہی پسندیدہ و بہتر ہے اس لئے تقریباً سوا دس بجے جنازہ اٹھایا گیا۔ اب ہجوم کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ دیوبند سے باہر کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں آچکے تھے اور برابر چلے آرہے تھے۔ مجمع لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا۔ پورے شہر میں لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ یہ دل دوز خبر نشر کی جا رہی تھی۔ ادھر آل انڈیا ریڈیو مختلف اوقات میں حضرت کے انتقال کی خبر نشر کر چکا تھا۔ ریڈیو پاکستان بھی اپنے سننے والوں کو یہ روح فرسا خبر اپنے بلیٹن میں سُنا چکا تھا۔ اس لئے جنگل کی آگ کی طرح اس سانحہ کی خبر ملک اور بیرونِ ملک میں پھیل چکی تھی۔ جو دیوبند پہونچ سکنے کی پوزیشن میں تھے وہ دیوبند پہنچ رہے تھے۔ بہر حال نمازِ جنازہ مولانا سالم صاحب نے پڑھائی۔ جنازہ قبرستان کی طرف

چلا تو انسانوں کا ایک سمندر تھا جو بہہ رہا تھا۔ ہر شخص کی تمنا تھی کہ وہ کندھا دے۔ مگر اس سمندر میں جو موجیں مارتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اچھے اچھوں کی ہمتیں جواب دے رہی تھیں۔ ہمت والے ہی کندھا دے پا رہے تھے۔ اور ہمت والے ہی جنازہ کی بلیوں کو چھو پا رہے تھے۔ لوگ پروانہ وار ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ وارفتگی کی ایک حالت تھی جو سب پر طاری تھی۔ جو لوگ جنازہ تک پہنچنے کی ہمت نہیں پا رہے تھے وہ بڑی حسرت اور غم کے ساتھ اس نمونۂ اسلاف، ولی باصفا، مقتدائے زمانہ، شیخ وقت، فخر قوم، عالم باعمل کے سفر آخرت کے دل دوز مناظر دیکھ رہے تھے۔ عقیدت مندوں کے کاندھوں پر حضرت کا جنازہ آہستہ آہستہ قبرستان تک پہنچا۔ منٹوں کا فاصلہ گھنٹوں میں طے ہوا۔ اس بے اندازہ ہجوم نے دعاؤں اور آہوں کے سائے میں بادیدہ نم اس پیکر صبر و رضا، مجسمہ تحمل و تشکر زمین کی آغوش میں ابدی راحت کے لئے سلا دیا۔ لوگ مٹی دیتے رہے اور حسرتوں کے ساتھ قبر۔۔ کو دیکھتے رہے۔ نہ جانے کتنے لوگ ہوں گے جن کو بے اندازہ ہجوم کی وجہ سے مٹی دینے کی ہمت بھی نہ ہو سکی اژدہام ہجوم میں پھنسنے کے پھنسے رہ گئے۔ حضرت کے جسد ظاہری کے ساتھ ایک تاریخ دفن ہو گئی۔ ایک روشنی تہہ خاک چلی گئی، ایک خوشبو خلاؤں میں گم ہو گئی، ایک روایت ختم ہو گئی، علم و عمل کا ایک نمونہ اوجھل ہو گیا۔ رشد و ہدایت کی ایک شمع گل ہو گئی، لوگ قبرستان سے ہاتھ جھاڑتے ہوئے یوں واپس ہو رہے تھے۔ جیسے کسی نے بہت قیمتی دولت ان کے ہاتھوں سے چھین لی ہو۔ ہر زبان پر حضرت کے محاسن اور فضائل کا تذکرہ تھا، ہر شخص حضرت کی جدائی کی تکلیف اپنے قلب میں محسوس کر رہا تھا۔ ہر چہرہ اندوہ غم کا آئینہ بنا ہوا تھا۔ دیوبند کے در و دیوار پر اداسی چھا رہی تھی۔

جامع مسجد کے میناروں سے حضرت کے انتقال کی خبر نشر ہو رہی تھی تو احساس ہوتا تھا کہ یہ مینارے رو رہے ہیں، جنھوں نے پچاسوں برس حضرت کے خطاب، حضرت کی تقاریر اور مواعظ سنے ہیں۔ وہ فریاد کرتے محسوس ہو رہے تھے کہ اب ہم یہ آوازیں کس سے سن سکیں گے۔ اب حضرت کی زیارت کیسے اور کہاں ہو سکے گی۔ اخلاق و محبت کی یہ خوبصورت تصویر اب ہمیں کہاں دکھائی دے گی۔ حضرت علیہ الرحمہ دیوبند کے قیام کے دوران جمعہ کی نماز کے لئے جامع مسجد میں تشریف لاتے اور امامت فرماتے تھے۔ مگر اب گھر سے مسجد تک کا راستہ اور مسجد کے منبر و محراب انتظار کرتے رہیں گے اور حضرت کی راہ تکتے رہیں گے، مگر حضرت کو نہ دیکھ سکیں گے۔ یہ کیسا مقام حسرت ہے اب ان کو تسلی کون دے گا اب ان کی ڈھارس کون بندھائیگا۔ ان باتوں کا خیال آتا ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند جس سے حضرت کا جسم و جاں کا تعلق رہا، آج غم و الم کی تصویر بنا کھڑا ہے۔ اس کا اٹھاون سالہ خادم، اس کا مربی، اس کا مہتمم جس نے اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ اس کی مخلصانہ خدمت کی اس کو پروان چڑھایا۔ اس کو شباب و عروج کی منزلوں سے آشنا کیا۔ اپنے خونِ جگر سے اس کو سینچا آج وہ ہمیشہ کے لئے اس سے رخصت ہو رہا ہے۔ ہمیشہ کے لئے اس کو الوداع کہہ رہا ہے۔ احاطہ مولسری، بابِ قاسم، دارالحدیث کا پُر شکوہ گنبد اپنے اس محسن و مربی کا آخری دیدار کر رہے ہیں۔ اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں اے جانے والے تجھ پر سلام، تیری وفاؤں کو سلام، تیری بزرگانہ اداؤں کو سلام۔ اب تیرے بعد تجھ سا کون ہوگا جو ہماری دیکھ ریکھ، ہماری حفاظت و صیانت تیری طرح کر سکے گا، تو نے اپنے آبا رد

اجداد کی امانت کی حفاظت کا حق ادا کر دیا۔ اب کون اس کو وہ کنی اور جگر کا دی کے لیئے آئے گا ہے مکرر لب پر ساقی یہ صدا تیرے بعد۔ جانے والا جا چکا اور رہ جانے والوں کے لیئے فراق و جدائی کا دھواں چھوڑ گیا۔ غموں کے اس دھوئیں میں اس وقت کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ تاحدِ نظر اندھیرے میں نگاہیں بھٹک رہی ہے۔ پاؤں ٹھٹھک رہے ہیں۔ خیالات میں بھونچال سا آیا ہوا ہے۔ قلب و ذہن ماؤف سے ہو رہے ہیں۔ یقین سا نہیں ہو رہا ہے کہ یہ حادثہ فاجعہ واقع ہو چکا ہے۔ یہ قیامت سروں سے گذر چکی ہے۔ حضرت حکیم الاسلام علیہ الرحمہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ حضرت موجود ہیں۔ جائیں گے تو زیارت کریں گے۔ اور آپ کے کلمات طیبات سے مستفید ہو لیں گے۔ وہی نورانی چہرہ وہی مسکراتے ہونٹ وہی شفقت وہی محبت کی دل فریب ادا نظروں میں بسی ہے وہی فرشتوں کی سی صورت پیشِ نظر ہے، جو ہر آنے والے کا استقبال کرتی اور اس کو مسرور و مطمئن کرتی تھی۔ جگہ جگہ لوگوں کا ہجوم ہے آپس میں باتیں ہو رہی ہیں۔ آج سب جگہ ایک ہی موضوع مرکزِ گفتگو ہے۔ حضرت کی ذات، آپ کے کمالات، آپ کے محاسن، آپ کے فضائل، آپ کی خوش خلقی، آپ کا علمی مرتبہ، آپ کا روحانی منصب وغیرہ بڑی عقیدت سے زبانوں پر جاری ہے۔ ایک عمر رسیدہ شخص کہہ رہے تھے، حضرت مہتمم صاحب پرانے بزرگوں کا نمونہ تھے۔ ان کو دیکھ کر بزرگوں کی یاد آتی تھی۔ ایک صاحب کی عقیدت یوں بول رہی تھی، آج دیوبند بزرگوں کی آخری نشانی سے محروم ہو گیا ہے۔ ایک صاحب یوں سخن طراز تھے وعظ و خطابت کا بے تاج بادشاہ رخصت ہو گیا ہے۔ اب ایسی دلکش

آواز کہاں سننے کو ملے گی۔ ایسی حکیمانہ باتیں کون سنائے گا۔ ایک صاحب محوِ کلام تھے کہ دارالعلوم دیوبند کو اپنے خونِ جگر سے سینچنے والا اور اس کے نام اور پیغام کو ملک در ملک پہونچانے والا اس کے مقصد اور کاز کو دنیا سے متعارف کرانے والا شاید ہی کوئی میسر آسکے گا۔ ایک بوڑھی عورت کی آواز میرے کانوں میں آئی وہ بیچاری کہہ رہی تھی جب میں پریشان ہوتی ہوں اور جی گھبراتا ہے تو حضرت کی خدمت میں آکر دعا کراتی ہوں۔ آپ مجھے تسلی دیتے اور طبیعت کو سکون آجاتا تھا۔ اب میں کہاں جاکر اپنی پریشانی دور کرسکوں گی۔ ایک صاحبِ علم و فضل بزرگ فرما رہے تھے کہ ہمیں حضرت کی مجلس میں بیٹھ کر حضرت تھانوی رہ کی مجلس کا مزہ آتا تھا۔ حکیمانہ انداز، دلنشیں بیان، مدلل اور محکم گفتگو، علمی نکات، اکابر کی تحقیقات حضرت کے یہاں سب کچھ ملتا تھا۔ افسوس اب یہاں کی بہار ہم سے روٹھ کر چلی گئی۔ قضائے الٰہی کے سامنے مجال دم زدن نہیں ورنہ ہم اپنی زندگی دے کر اگر حضرت کو بچا سکتے تو بچا لیتے۔

یہ مختلف الخیال لوگوں کے تأثرات ہیں جن سے حضرت کے لیئے بے پناہ محبت و عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت کی ذات میں جو کشش اور محبوبیت کی جو شان رکھی تھی اس کا نمونہ ہے۔

حضرت کے انتقال کے بعد ملک و بیرونِ ملک میں جس اضطراب اور غیر معمولی رنج و الم کا اظہار کیا گیا ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دور میں مرجعیت اور مقبولیت کی ممتاز شان عطا فرمائی تھی۔ حضرت حکیم الاسلام رہ نے ۸۶ برس کی عمر پائی آپ نے پوری تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی۔ وقت کے قابل و فاضل اساتذہ سے آپ نے استفادہ کیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے

والد بزرگوار فاضلِ وقت، ادیب شہیر مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ کے ہاتھوں آپ کی بسم اللہ کرائی گئی۔ حفظ کلام پاک اور فارسی وغیرہ سے فارغ ہو کر عربی شروع کی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رہ، مولانا غلام رسول صاحبؒ، مولانا اعزاز علی صاحبؒ، مولانا گل محمد خاں صاحبؒ، حضرت شیخ الہند رہ، مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ آپ کے اساتذہ رہے اور ترمذی شریف اور بخاری شریف علامہ کشمیری رہ سے پڑھیں۔ ابوداؤد آپ نے جنیدِ وقت حضرت میاں صاحبؒ سے پڑھی۔ ۱۳۳۷ھ میں آپ نے فراغت حاصل کی۔ علماء صلحاء نے مسرت داطمینان کا اظہار کیا کہ خاندانِ قاسمی کے سلسلہ فیض کے آگے بڑھنے اور پھیلنے کا سرد سامان ہو گیا۔ مشکوٰۃ شریف آپ نے اپنے والد بزرگوار مولانا محمد احمد صاحبؒ سے پڑھی۔ چنانچہ حضرتؒ کے ہی بیان کے مطابق حدیث سے مناسبت حضرت حافظ صاحبؒ کے درس ہی سے حاصل ہوئی۔ تحقیق وتفحص مطالعہ وکتب بینی اور علمی ذوق آپ کو علامہ کشمیری کے فیضِ صحبت سے میسر آیا۔ حسنِ بیان اور خوبی کلام کی دولت آپ کو علامہ شبیر احمد عثمانی رہ کے یہاں سے ملی۔ علوم ظاہری کیساتھ تزکیہ وتطہیر باطن کے لئے بزرگوں کے طریقہ کے مطابق آپ نے اولاً حضرت شیخ الہند رہ سے بیعت کی حضرت کی رہنمائی میں آپ نے سلوک وطریقت کی منزلیں طے کرنی شروع کیں۔ حضرت شیخ الہند رہ کے انتقال کے بعد آپ نے حضرت علامہ کشمیری رہ سے اپنا سلسلہ اصلاح استوار کیا۔ حضرت کشمیری نے باقاعدہ بیعت تو نہیں کیا مگر اذکار کی تعلیم دیتے رہے۔ اس کے بعد آپ کا تعلق بیعت مجدد امت حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ سے قائم ہوا۔ حضرت نے خصوصی توجہ

اور بھرپور شفقت کے ساتھ آپ کی رہنمائی کی اور تربیت فرمائی۔
خانوادۂ قاسمی کا چشم وچراغ اور نسبتِ قاسمی کا حامل بہت جلد اہلیت اور صلاحیت کی منزل تک پہونچا۔ حضرت تھانوی نے آپ کی حالت وکیفیت کا اندازہ کرکے آپ کو خلافت سے نوازا۔ اور آپ کا شمار حضرت کے جلیل القدر ممتاز خلفاء میں ہونے لگا۔ آپ نے اپنے مرشد وشیخ کی خدمت میں آمدورفت، خط وکتابت کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ آپ کا بیان ہے کہ ایک دن حضرت تھانوی کا گرامی نامہ ملا۔ اس میں تحریر فرمایا تھا۔

"بے ساختہ میرے دل پر یہ وارد ہوا ہے کہ میں تمہیں خلافت دوں اس لئے میں تم کو خلافت دیتا ہوں۔ جو کوئی بنیت تربیت واصلاح آئے اسے توبہ کرادیا کرو اور مشائخ کے معمولات تلقین کردیا کرو۔ اصلاحی باتیں پوچھے تو بتادیا کرو۔ اور جو کوئی بیعت ہونا چاہے اسے بیعت کرلیا کرو۔ یہ تمہارے لئے نافع ہوگا۔ اور مستفدین کے لئے بھی"

حضرت حکیم الامت کا یہ گرامی نامہ حضرت مہتمم صاحب کی قابلیت وصلاحیت اور اصلاحِ حال کی ایک بڑی شہادت ہے۔
اور پھر بعد کو حضرت مہتمم صاحب نے جس طرح خلقِ خدا کی رہنمائی فرمائی۔ تلقین وذکر کے ذریعہ، بیعت وارشاد کے ذریعہ اپنے مشائخ کی روحانی امانت کو جس احتیاط اور اہتمام کے ساتھ لوگوں تک پہنچایا اس نے حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کی مذکورہ بالا شہادت کو سچ کر دکھایا۔ آج ہندوستان وپاکستان ہی نہیں، بلکہ سعودی عرب، افریقہ، بنگلہ دیش، انگلستان، سری لنکا، برما، اور افغانستان تک میں آپ کے متوسلین، معتقدین موجود ہیں۔ ان میں بہت سے صاحبِ ارشاد ہیں اور حضرت کے مجاز ہیں، جو

اللہ کی مخلوق کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ اور اسی طرح بزرگوں کا فیض سلسلہ درسلسلہ آگے بڑھ رہا ہے اور انشاء اللہ اسی طرح آگے بڑھتا رہے گا۔ اور متقدمین و متاخرین سب بزرگوں کے لئے صدقہ جاریہ بنا رہے گا۔ حضرت کی مجلسوں میں یوں تو تمام ہی اکابر کا تذکرہ ہوتا۔ اور حضرت بڑے شوق سے تذکرہ فرماتے اور بزرگوں کے واقعات بڑے دل نشیں انداز میں سناتے۔ جن لوگوں کو حضرت کی زبان سے بزرگوں کے واقعات سننے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس کی گواہی دیں گے کہ حضرت کا بیان اس باب میں کتنا پُر لطف، دلچسپ اور ایمان افروز ہوتا تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت کے یہاں جب علامہ کشمیری رح اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکرِ خیر ہوتا تو پھر حضرت کے بیان میں والہانہ کیفیت اور عاشقانہ شان پیدا ہو جاتی تھی۔ گہری عقیدت اور دلی محبت آپ کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتی تھی۔ علامہ کشمیری رح کا علمی پایہ، ان کی وسعتِ معلوم، ان کا تقویٰ و طہارت، ان کی قوتِ حافظہ، ان کی صداقت، ان سب چیزوں کا تذکرہ بڑی تفصیل سے فرماتے۔ اپنی طالب علمی کا زمانہ اور حضرت کشمیری رح کی نظرِ عنایت کا ذکر بڑے چاؤ بڑے پیار سے فرماتے۔ بے تکلف فرماتے تھے کہ حدیث و قرآن سے جو تھوڑی بہت مناسبت پیدا ہوئی وہ علامہ کشمیری رح کا فیضان ہے۔ علامہ کشمیری رح کو اللہ تعالیٰ نے وہ نظرِ کیمیا اثر عطا فرمائی تھی کہ جس پر پڑ گئی سونا بنا گئی۔ ان کے تلامذہ میں ایک سے ایک صاحبِ مقام عالم بنا اور ایک دنیا کو اپنے علم کی روشنی سے منور کیا۔ حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ بھی اسی سنہری زنجیر کی کڑی تھے۔ اسی طرح حضرت تھانوی رح کا جب ذکر آپ فرماتے تو اس میں بھی عقیدت و محبت کا وہی رنگ ہوتا جو

ایک طالب صادق کے بیان میں ہونا چاہیئے۔ حضرت تھانوی رح کی جامع الکمال شخصیت، آپ کی بصیرت، آپ کا اصلاحی رنگ، آپ کا علم و تفقہ، آپ کا زہد و اتقاء، یہ سب چیزیں جب حضرت حکیم الاسلام رح کی زبان سے بیان ہوتیں تو سماں بندھ جاتا۔ سننے والا اپنے آپ کو حضرت تھانوی رح کی مجلس میں بیٹھا ہوا محسوس کرتا۔ سننے والے سنتے اور دیکھنے والے دیکھتے کہ حضرت تھانویؒ کی تربیت کا کس قدر گہرا اور محکم رنگ حضرت کی طبیعت میں پایا جاتا تھا۔ وہی حکیمانہ انداز، وہی نکتہ آفرینی وہی تعمقِ نظر، وہی بصیرت بیان و کلام میں وہی تنوع جو وہاں تھا اس کی روشنی یہاں بھی نظر آتی۔ اسی لئے یہ متفقہ رائے ہے کہ حضرت کی مجلس خالص علمی مجلس ہوتی تھی۔ فضول اور لایعنی باتوں کے لیے اس میں کوئی گنجائش نہ ہوتی۔ بدگوئی یا بدکلامی کا اس میں کوئی گذر نہ ہوتا تھا۔ کوئی بھی شخص آپ کی مجلس میں بیٹھ کر دینی اور علمی فیض سے تہی دست نہیں جاتا تھا۔ ہر جانے والا بقدر ظرف اپنے دامن میں ایمان و یقین، علم و عمل کے قیمتی موتی لے کر اٹھتا تھا۔ کبھی یہ ہوتا کہ حضرت از خود کوئی بات فرماتے کوئی علمی موضوع چھیڑ دیتے اور کبھی کوئی شخص سوال کرتا تو آپ اسکے تفصیلی جواب سے مستفید فرماتے۔ اور مجلس میں تا دیر علم و فن کی خوشبو مہکتی رہتی۔ اور دین و ایمان کا چراغ جگمگاتا رہتا۔ دل کو مطمئن کر دینے والا وہ انداز جو حضرت تھانویؒ کے یہاں تھا وہی حکیم الاسلام کے یہاں بھی جادہ فرما تھا۔ بزرگوں کی طرح آپ کی گفتگو یا تقریر کا مستدل یا مرجع قرآن و حدیث ہی ہوتے تھے۔ جب اونچی بات کی دلیل یا شہادت میں آپ کلام اللہ شریف یا حدیث پاک پیش فرماتے تو سننے والا ایک روحانی لذت اور قلبی طمانیت محسوس کرتا۔ اور یہی چیز آپ کے علمی استحضار کی دلیل بھی تھی قرآن و حدیث کے سے آپکی گفتگو باہر نہیں ہوتی تھی۔ اور اسی سے آپ کا

عالمانہ وقار ظاہر ہوتا تھا۔

غرض یہ کہ تحریر و تقریر کا بادشاہ، سلوک و طریقت کا امام، اکابر کا نمونۂ عمل، فہم و بصیرت کا پیکر، دارالعلوم دیوبند کا امین و امیر، عالمِ اسلام کا ممتاز عالم، طلباء کا شفیق، علماء کا مربیؔ، عوام کا رہنما، خواص کا ہمدرد و غمگسار، اسوۂ رسول کا متبع، نرم خو، نرم دل، شیریں گفتار و خوش کردار با خدا آج رخصت ہو گیا ہے۔ خدا اس کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

وہ صورتاں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

آپ کی پیدائش ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء میں اور وفات ۱۹۸۳ء میں ہوئی۔

مزارِ قاسمی دیوبند میں اپنے دادا حضرت نانوتویؒ کے پاس آپ کی ابدی آرام گاہ ہے۔

حادثۂ جانگداز

حضرت مولانا عبدالاحد صاحب

(طاب اللہ ثراہ)

کے حادثۂ وفات پر

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
ٹکڑا کوئی جہاں پڑا پایا اٹھا لیا

بڑا ہی دلگداز و صبر آزما تھا وہ لمحہ جب ۱۳ اکتوبر کو پو پھٹنے سے پہلے کسی خبر دینے والے نے یہ خبر دی کہ محدث کبیر مولانا عبدالاحد صاحب انتقال فرما گئے۔ کچھ ہی دیر گذری تھی کہ دار العلوم سے فجر کی اذان شروع ہوئی اور اس کے بعد مؤذن نے لاؤڈ سپیکر سے اس روح فرسا سانحہ کی خبر نشر کی۔ نمازِ فجر کے بعد دارالعلوم کے طلبہ، اساتذہ اور شہر کے لوگ جوق در جوق مولانا کے مکان پر پہنچنا شروع ہو گئے۔ ایک انبوہِ کثیر نے مولانا کا آخری دیدار کیا

جو شخص بھی دیکھ کر آتا، رنج و الم کی ایک تصویر دکھائی دیتا تھا کتنی ہی آنکھوں میں آنسو تھے، کتنے ہی دلوں کا درد آہوں میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اہلِ خانہ اور اعزا پر سراسیمگی اور درد و الم کی بڑی کربناک کیفیت طاری تھی۔ ہر شخص بقدرِ تعلق اس حادثہ کی چوٹ محسوس کر رہا تھا۔ کوئی نہیں تھا جس نے اس حادثہ کی خبر سُن کر دل نہ تھام لیا ہو۔ ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے والے اس مسافر کو آخری منزل تک پہنچانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ تلامذہ اور عقیدت مند متعلقین اور اقرباء اس امانت کو پورے اکرام و اعزاز کے ساتھ لیکے چلے۔ اور حکمِ الٰہی کے آگے سرنگوں ہو کر علم و عمل، سادگی اور نیکی کے اس مجسمہ کو قبرستانِ قاسمی میں آسودہ خواب کر دیا۔ مولانا مرحوم کافی دنوں سے علیل چل رہے تھے۔ بار بار کی علالت سے کمزوری کافی بڑھ گئی تھی مگر اپنے معمولات ادا کرتے رہتے تھے۔ پچھلے سال دارالعلوم کے اجلاس صد سالہ کے لئے ایک طویل سفر کیا۔ بلا کی گرمی اور اس پر تقریباً تین ماہ کا مسلسل پُر صعوبت سفر، اس نے فی الحقیقت مولانا کو بہت متأثر کیا۔ سفر اپنے مقصد میں کامیاب رہا مگر صحت مستقل طور پر جواب دے گئی۔

مولانا اپنے والد بزرگوار استاذ الکل مولانا عبدالسمیع صاحب کے صاحبزادے اور ان کی علمی اور روحانی امانتوں کے امین اور ان کے سچے جانشین تھے۔ آپ نے علوم دینیہ کی تکمیل دارالعلوم میں ہی کی۔ اس وقت کے موجود فاضل اساتذہ سے آپ نے کسب فیض کیا اور فراغت کے بعد دارالعلوم ہی میں تدریسی خدمات انجام دینی شروع کر دیں۔ بیالیس برس سے زیادہ طویل مدت خدمت میں ہزاروں طلباء آپ سے مستفید ہوئے۔ اور بالواسطہ مستفدین کی تعداد

یقیناً لاکھوں تک پہونچے گی جو بلا شبہ آپ کے لئے صدقہ جاریہ ہیں اور انشاء اللہ تعالیٰ آپ کے لئے رفعِ درجات کا سبب بنتے رہیں گے۔

مولانا اپنی ذات، اپنے مزاج اور اپنی فطرت کے اعتبار سے بڑے متواضع، بڑے خلیق، نہایت کم گو اور مخلص تھے۔ وضع کے پابند اور سادگی کے پیکر تھے۔ بڑوں کا اکرام، چھوٹوں پر شفقت اور برابر والوں کے ساتھ محبت کا معاملہ فرماتے تھے۔ بڑے خندہ جبیں، کشادہ رو اور مہمان نواز واقع ہوئے تھے۔ آپ کا دسترخوان دیوبند کے ان گنے چنے دسترخوانوں میں سے ایک تھا جہاں کوئی بھی شخص وقت پر پہنچتا تو کھانا کھائے بغیر واپس نہیں ہوسکتا تھا۔ حضرت کا مکان اور آپ کی بیٹھک آنے والوں کی کثرت کی وجہ سے بعض اوقات مہمان خانہ محسوس ہوتے تھے۔ وہی سادہ معاشرت جو علماءِ دیوبند کا امتیاز رہی ہے، آپ اس کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ کبھی بیش قیمت لباس پہنے آپ کو نہیں دیکھا گیا۔ اور اس کو بھی آپ کی سادہ طبعی کی ایک ہی مثال سمجھئے کہ پوری زندگی میں کبھی آپ نے شیروانی نہیں پہنی۔ عید کے علاوہ چوغہ کا، لمبے قبا کا استعمال بھی آپ نہیں کرتے تھے۔

سادگی اور تواضع یہ دو جوہر آپ کے اندر بہت نمایاں تھے۔ اکثر اوقات اپنے چھوٹوں سے اس طرح ملتے کہ شرمندگی ہوتی۔ آپ کی سیرت و صورت کے مشاہدے کے بعد باضمیر انسان اسی نتیجہ تک پہنچتا تھا کہ احساس برتری یا کبر و نخوت آپ کو چھو کر بھی نہیں گذرا ہے۔ یہی سادہ اور بے تکلف اندازِ گفتگو آپ کے درس اور آپ کی تقریر میں ہوتا تھا۔ بھاری بھرکم الفاظ، لہجے کا

اتار چڑھاؤ، تو اصنع اور تکلف کے بجائے چھوٹے چھوٹے سادہ اور سلیس جملوں میں بات کرنے کے عادی تھے۔ عوام و خواص میں آج کل تقریر و خطابت کا جو نیا انداز اور اسٹائل مروّج ہے، مولانا مرحوم کا بیان و تقریر اس سے عاری ہوتا مگر ان کو آپ کی روحانیت اور کمالِ اخلاص ہی کہیے کہ لوگ آپ کا بیان عقیدت و محبت اور توجہ سے سنتے تھے اور محظوظ ہوتے تھے۔ طلبہ میں اپنے اساتذہ اور بزرگوں سے تعلق اور ارتباط آج کے دور میں بس واجبی سا رہ گیا ہے نہ اساتذہ ہی ایسے شفیق اور مخلص رہے ہیں اور نہ طلبہ میں ایسی محبت و عقیدت رہ گئی ہے۔ لیکن مولانا کی نیکی، للّٰہیت، اخلاص اور بے تکلف سادہ وضع کے سبب طلبہ کی آمد و رفت آپ کے یہاں بہت کثرت سے رہتی تھی۔ دارالعلوم کے پرانے اساتذہ میں شاید چند ہی ایسے رہ گئے ہوں جن سے طلبہ اس درجہ مانوس و منسلک ہوں جتنے مولانا سے تھے۔ آپ سبق پڑھا کر آتے تو اکثر طلبہ آپ کے ساتھ ہوتے تھے۔ مکان پر بھی طلبہ کے ساتھ آپ کی نشست رہتی۔ طلبہ بے تکلف اپنے معاملات و مسائل بیان کرتے، علمی سوالات کرتے اور مستفید ہوتے۔ آنے والوں کی مدارات جن میں طلبہ بطور خاص شامل ہوتے" آپ کی سیرت کا ایک تابندہ رُخ تھا۔ اسی پر اکتفا نہیں بلکہ نادار اور ضرورت مندوں کی خبر گیری اور اعانت کرنا بھی آپ کا خصوصی وصف تھا اس میں طلبا، اور اقربا رشامل تھے۔ اور پاس پڑوس والے بھی نہ جانے کتنے ایسے لوگ ہوں گے جن کی کلی یا جزوی کفالت مولانا فرماتے تھے اور ان کی دعائیں لیتے تھے۔ آج مولانا کی رحلت پر نہ جانے کتنی آنکھیں اس لئے اشکبار ہیں کہ ان کی کفالت کا ظاہری سہارا ٹوٹ گیا ہے۔

ذھب الذین یعاش فی اکنافھم
بقی الذین حیاتھم لا تنفع

مولانا دارالعلوم کے صفِ علیا کے مدرس تھے۔ حدیث و تفسیر کی کتابیں آپ کے زیرِ درس رہتی تھیں۔ آپ کا اندازِ درس محدثانہ اور محققانہ ہوتا تھا۔ آپ اپنے مخصوص انداز میں فن کے اصولی مباحث تحقیقی شان کے ساتھ اس طرح بیان فرماتے تھے کہ طلبہ کے سامنے مسئلہ پوری طرح واضح ہو جاتا تھا۔ آپ کا تدریسی تعمق، نظرِ مطالعہ و محنت اخلاص مندی اور طہارتِ قلب و نظر، تعلق مع اللہ، رفعتِ کردار، صفائے باطن، جیسے اوصاف و خصائل کا یہ ثمرہ تھا کہ آپ کا درس محض درس ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ روحانیت و نورانیت سے معمور ایک بابرکت مجلس بھی ہوتی تھی اور محسوس کرنے والے اس کو بخوبی محسوس کرتے تھے۔ بہت سے اہلِ علم و فضل و خیر کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ آپ مستجاب الدعوات ہیں۔ نماز و دعا میں آپ کی انابت و خشیت الی اللہ دیکھنے اور محسوس کرنے کی چیز تھی۔ تلاوت و ذکر میں سوز و گداز الحاح و زاری، خوف و خشیت، امید و بیم حرارت و حلاوت تاب و طپش کی وہ ایمان پرور کیفیت ہوتی تھی کہ اس کو دیکھنے یا سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

جن لوگوں کو مولانا کی نماز و دعا میں شریک ہونے کا موقع ملا ہے وہ اس کی تصدیق صرف زبان سے نہیں بلکہ یقیناً دل سے کریں گے آپ دیوبند کی جامع مسجد کے مستقل خطیب تھے۔ یہاں کے منبر و محراب تا دیر آپ کو نہیں بھولیں گے۔ آپ کی پُر وقار آواز، بلیغ خطبہ، عالمانہ شان، جمعہ کا مبارک دن، اہلِ ایمان کا مجمع، جامع مسجد کے خوبصورت اور پُرشکوہ در و دیوار ایک عجیب ایمان پرور

اور روح نواز سماں بن جاتا تھا جس کی لذت و لطافت ہر شخص محسوس کرتا تھا۔ افسوس یہ روح پرور کیفیت اب نہیں ملے گی ے

آں قدح شکست واں ساقی نماند
ایک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

۱۱ رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ آپ کا سنِ پیدائش ہے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے دار العلوم دیوبند میں حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۳۴۳ھ میں عربی تعلیم کی ابتدا کر کے ۱۳۵۵ھ میں فراغت حاصل کی۔ دورۂ حدیث آپ نے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ سے پڑھا۔ ۱۳۵۷ھ میں آپ دار العلوم میں مدرس عربی مقرر ہوئے۔ ۴۴ سال سے زائد آپ نے دار العلوم میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ہر علم و فن کی کتابیں آپ کے زیرِ درس رہیں اور دار العلوم کے صفِ اول کے اساتذہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ اور صرف دار العلوم ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں آپ کو اکرام و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ آپ کے گوناگوں اوصاف کی وجہ سے تمام چھوٹے بڑے آپ سے محبت و عقیدت رکھتے تھے۔ چھ مرتبہ آپ بیت اللہ شریف کی زیارت سے مشرف ہوئے جو ایک مومن کی معراجِ ایمان ہے۔ اس کو بھی خوش بختی اور جذبۂ ایمان کی ایک علامت ہی سمجھئے کہ تقریباً تمام اہلِ خانہ کو بھی آپ نے اس سعادتِ عظمیٰ سے بہرہ اندوز کرایا۔ یوں تو حج کا مبارک سفر ہر مومن کے لئے ہی رحمت و سعادت برکت و بہبت کا ذریعہ ہوتا ہے اور وہاں جانے والا بقدرِ ظرف کچھ نہ کچھ لے کر ہی آتا ہے۔ لیکن علم و تقویٰ کا حامل اگر کوئی شخص حج کرے تو سوز و گداز، درد و اثر، کیف و سرور، جذب و جنوں

کی کچھ اور ہی کیفیت ہوتی ہے۔ مولانا کو دیکھنے والے اس کے شاہد ہیں کہ ان کی طاعت و عبادت، ذکر و فکر، خوف و خشیت توبہ و توجہ الی اللہ میں زیارت بیت اللہ کے بعد ایک عجیب ایمان پرور شان پیدا ہو گئی تھی۔ قرآن پاک کی تلاوت اور دعا میں اس شان کا ظہور بطورِ خاص ہوتا تھا۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھتے تو محویت اور سپردگی، ذوق و شوق کی ایک ایسی کیفیت طاری ہو جاتی جس کو سوزِ ایمانی کے سوا کوئی نام نہیں دیا جا سکتا اور کہنا چاہیے کہ ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

معاملات کی صفائی اور ادائے حقوق کا آپ کو اس درجہ اہتمام تھا کہ وفات سے ایک یوم پہلے اپنے منجھلے صاحبزادے حافظ محمد سالم کو تمام ضروری امور نوٹ کرائے، جس کا لینا دینا تھا تحریر کرایا۔ اور ادائیگی کی تاکید کی۔ چند نمازیں جو دورانِ علالت فوت ہو گئی تھیں ان کا فدیہ دینے کی تاکید کی۔ دارالعلوم کے لیے اپنے فنڈ میں سے ایک ہزار روپے دینے کی وصیت فرمائی۔ اس کے علاوہ اور ضروری باتیں لکھائیں۔ محاسبۂ آخرت کا خوف نہ ہو تو ایسے امور کی طرف آدمی کا دھیان بھی نہیں جاتا۔ دنیاوی مشغلوں میں ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے۔ لیکن جس کو حق تعالیٰ علم کی دولت اور احساسِ ذمہ داری کی نعمت سے نوازتے ہیں وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی اہمیت کو سمجھتے اور ان کی ادائیگی کی فکر کرتے ہیں۔

مولانا مرحوم اب دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کی خوبیاں،

ان کے اوصاف، ان کی اچھائیاں، ان کی ہمدردیاں بعد والوں کو کبھی نہیں بھولیں گی۔ وہ دلوں میں، ذہنوں میں، یادوں میں، خیالوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

تاریخ علم و عمل کی ایک سنہری کڑی، وضعداری کی مثال، اپنے بزرگوں کی روایات کا ایک خوبصورت اور دل آویز نمونہ، تقویٰ و طہارت کی ایک نظیر، دردمندیوں اور ہمدردیوں کی ایک تصویر، محبتوں اور شفقتوں کا پیکر، اطاعت و انابت کا ایک نقش جمیل، محدث و فقیہ، عالم باعمل، زاہد شب زندہ دار، سوز و گداز کا آئینہ، تواضع اور انکساری کی ایک روایت، بزرگانہ تہذیب و اخلاق کا حامل۔ دارالعلوم دیوبند کی تابندہ تاریخ کا ایک روشن باب، مومن قانت کی ایک ادائے دل نواز، خوبیوں اور خوش اطواریوں کی ایک تابندہ حقیقت، یہ تمام باتیں ایک شخص کے چلے جانے سے رخصت ہوئیں۔ کسی کے چلے جانے سے دنیا کے کاموں اور اس کے معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سورج چاند کی گردشیں، موسموں اور فصلوں کے تغیرات، ہواؤں اور فضاؤں کی تبدیلیاں، گرمی اور سردی کی آمد و رفت، خشکی اور تری کے اثرات، شادی اور غمی کے چرچے، امنگوں اور اداسیوں کی کیفیتیں، مشاغل و مصروفیات، باہمی شکستہ خاطری اور شگفتہ دلی کے احوال و غرض کسی بھی چیز میں کوئی کمی یا کوتاہی نہیں ہوتی۔ مگر ایسا ضرور ہوتا ہے اور ایسا ضرور ہونا چاہیے کہ کوئی صاحب کردار، صاحب عمل، صاحب

علم و خبر درمیان سے اٹھ جائے تو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی دل و دماغ کو رنج والم، حسرت و یاس کا ایسا کرب انگیز احساس ستاتا رہتا ہے کہ زندگی کے تمام لطف اور اس کی تمام رونقیں اور روشنیاں مدھم اور موہوم سی محسوس ہوتی ہیں. بے جان و بے روح سی معلوم ہوتی رہتی ہیں. بے چینی اور بے کیفی، اضطراب اور خستہ دلی کی ایک ایسی کیفیت ہوتی ہے جو غم زدہ چہرہ پر کھلی کتاب کی طرح کوئی بھی آنکھ اس تحریر کو بآسانی پڑھ سکتی ہے. میں اگر یہ کہدوں کہ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبد الاحد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا سانحہ ارتحال پر ان کے منتسبین اور متعلقین غم والم کی ایسی ہی کیفیت کی تصویر بنے ہوئے ہیں تو ادنیٰ مبالغہ نہ ہو گا.

مولانا حالی کا شعر ہے ؎

تیرے بغیر رونقِ دیوار و در کہاں
شام و سحر کا نام ہے شام و سحر کہاں

سدا رہے نام اللہ کا جانیوالا گیا
اب صرف یادِ بے کراں ہے اور بس
صرف یادِ غم بے کراں رہ گئی
مرنے والا مر گیا داستاں رہ گئی.

وفات :- ۱۳ر اکتوبر ۱۹۷۹ء
۱۳۹۹ھ

قمر عثمانی (فاضل دیوبند)

اُجالے

ایک بزرگ کی توبہ کا قصہ ہے کہ ایک سال قحط تھا تمام مخلوق بہت پریشان تھی۔ اسی حالت میں دیکھا کہ ایک غلام بڑی بے فکری کے ساتھ گاتا ہوا بڑی خوشی کی حالت میں جا رہا ہے۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ مخلوق تو اتنی پریشان ہے اور تو اتنا بےفکر ہے کہ جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ میں بے فکر کیوں نہ ہوں میرے مالک کے یہاں تو دو گاؤں ہیں۔ بس اسکی یہ بات سُنکر دل پر ایک تیر لگا اور سوچا کہ اے نفس جسکے مالک کے یہاں دو گاؤں ہیں وہ تو بے فکر ہے۔ اور تیرے مالک کے قبضہ میں تو زمین و آسمان سارا جہان ہے تو پھر کیوں پریشان ہے؟

بس اسی وقت سے اللہ کی یاد میں مشغول ہو گئے۔

⁂ ⁂ ⁂

ہرمزان نام کا ایک شخص فارس کی فوج کا سپہ سالار تھا وہ مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ اور حضرت عمرؓ کے سامنے لایا گیا چونکہ اسکے جرائم زیادہ تھے حضرت عمرؓ نے اسکے قتل کا حکم دیدیا۔ جب اسکے قتل کیے جانیکا وقت آیا تو اس نے پینے کے لئے پانی مانگا۔ پانی لایا گیا۔ اس نے پانی کا گلاس منہ سے لگایا مگر فوراً ہٹا لیا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا بات پانی کیوں نہیں پیا۔ اس نے جواب دیا مجھے ڈر ہے کہیں آپ مجھے پانی پیتے ہوئے قتل نہ کرا دیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تم اطمینان رکھو جب تک تم یہ پانی نہ پی لوگے تمہیں قتل نہ کیا جائے گا۔ ہرمزان نے فوراً وہ پانی زمین پر پھینکدیا اور کہنے لگا اب آپ مجھ کو قتل نہیں کر سکتے۔ اسلئے کہ آپنے اس پانی کے پینے تک مجھ کو امن دیا ہے اور اس کا پینا اب ناممکن ہو گیا۔ اس لئے اب میرا قتل بھی ناممکن ہو گیا۔

ویسے آپکو ہر طرح اختیار ہے لیکن جو جملہ آپنے بولا تھا آپ اس پر غور کریں تو محسوس ہوگا کہ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ غرض یہ کہ حضرت عمرؓ نے اس کے قتل کا حکم واپس لے لیا اور اس کو آزاد کر دیا۔ یہ دیکھ کر ہرمزان فوراً اسلام لے آیا۔

⁂ ⁂ ⁂

ایک بزرگ کی خدمت میں کسی بادشاہ نے ایک قیمتی آئینہ بھیجا۔ آپنے خادم سے کہا اسکو اٹھا کر رکھ دو جب ہم کپڑا بدلا کریں گے تو اس کو منہ دیکھنے کیلئے استعمال کیا کریں گے۔ اتفاق سے خادم کے ہاتھ سے وہ آئینہ ٹوٹ گیا۔ خادم کو فکر ہوئی کہ کہیں پیر و مرشد ناراض نہ ہوں۔ غرض یہ کہ ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ " از قضا آئینہ چینی شکست "

بزرگ نے سنا تو فوراً جواب میں فرمایا " خوب شد اسباب خود بینی شکست "

⁂ ⁂ ⁂

امام ابو حنیفہ نے ایکمرتبہ ایک لڑکے کو دیکھا کہ کودتا ہوا جا رہا ہے۔ امام صاحب نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ " میاں صاحبزادے دیکھ کر چلو کہیں پھسل کر گر نہ پڑنا " لڑکے نے جواب دیا آپ اپنی خبر لیجیے کہ کہیں آپ پھسل جائیں کہ تمام عالم گمراہ ہو جائے۔ میرا کیا ہے اگر پھسل بھی جاؤں گا تو میرے ہی تھوڑی سی چوٹ آئے گی دوسروں کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا " امام صاحب اس لڑکے کے جواب سے بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ میاں صاحبزادے ہمارے پاس آؤ اور علم حاصل کرو۔